اکتوبر 60ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۴۳۰

جلد ۵۵ | عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۹ روپے | قیمت فی پرچہ دس آنے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۵	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کے فکر و نگاہ کے زاویے بدلتے ہیں۔ وہ کام جو اس کی حیاتِ اجتماعی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن پر اس کی فلاح و بقا کا سارا مدار ہوتا ہے، ان کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہونے لگتی ہے اور اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں وہ امور سمیٹ لیتے ہیں جو اس کے لیے قطعاً کسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات اُسے سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ اہمیت کے پیمانوں کا بدل جانا ہی درحقیقت اقدارِ حیات کی تبدیلی ہے اور پھر اس سے کعبۂ مقصود بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

اگر ہماری اس قوم کا مزاج درست ہوتا، اس کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز صحیح ہوتا تو کیا دینی تعلیم کی طرف سے وہ اتنی بے توجہی برت سکتی تھی جتنی کہ وہ فی الواقع برت رہی ہے۔ ہمیں اپنے نصب العین کی طرف لیجانے والی، ہمارے اندر زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کرنے والی، ہمیں اپنی صلاحیتوں کو صحیح راہ پر لگانے کی ترغیب دینے والی صرف دینی تعلیم ہی ہے۔ اسی کے ذریعہ ہمارے دلوں میں اعلائے کلمۃ الحق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، شہادت علی الناس کے بلند و بالا مقام کی نازک ذمہ داریوں کا احساس بیدار ہوتا ہے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اُمنگ پیدا ہوتی ہے

مگر اسے ہماری غفلت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے علم و عرفان کے ان چشموں کی طرف جہاں سے ہمارے نوجوان قرآن و سنت کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتے ہیں، کبھی توجہ نہیں دی اور اپنی بیشتر صلاحیتیں اُن اداروں میں کھپائی ہیں جو درحقیقت مغربی تہذیب کے حصار ہیں، جہاں مغرب کا

سیاسی تسلط ختم ہو جانے کے بعد بھی مادی آفاتِ حیات نہ صرف محفوظ و مامون ہیں بلکہ بڑی آزادی کے ساتھ پھلتی پھولتی ہیں اور ہر وقت جارحانہ پیش قدمی پر تیار رہتی ہیں۔ جامعہ حنفیہ ٹرسٹ لائل پور سارے مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے دینی مدارس کا جائزہ لیا اور اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ یہ ادارے سخت نامساعد حالات میں بھی کس طرح اپنے فرض کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اور انگریز کی غلامی اور اس کی جباری اور قہاری اپنی ساری سیاسی قوتوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود انہیں مٹانے میں سخت ناکام ہوئی ہے۔

اس جائزہ[1] کے مطابق پورے مغربی پاکستان میں اس وقت ۶۷۱ دینی ادارے کام کر رہے ہیں اور یہ تعداد صرف بڑے بڑے دارالعلوم اور ان مدارس عربیہ اسلامیہ پر مشتمل ہے جہاں درس نظامی یا کوئی اصلاح یافتہ دینی نصاب رائج ہے۔ محکمانہ مدارس اور ابتدائی مکاتب کو اس فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جائزہ کے مرتبین کی کوششوں کے باوجود اس امر کا پورا امکان موجود ہے کہ بہت سے دینی مدارس کا اندراج نہ ہو سکا ہو۔ اگر ایسے اداروں کی تعداد اس سے نصف مان لی جائے تو محتاط اندازہ کے مطابق اس وقت مغربی پاکستان میں ایک ہزار سے کچھ اوپر دینی مدارس خدا اور خدا کے رسول کا پیغام پھیلانے میں مصروف ہیں۔ یہ تعداد ہماری قومی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ایک ایسا خطہ جس میں تقریباً ساڑھے تین کروڑ انسان آباد ہوں، ان میں سے اگر صرف ایک کروڑ کو تعلیم حاصل کرنے کے قابل سمجھا جائے اور اس میں سے خواتین کی نصف تعداد نکال لی جائے تو ۵ ہزار نفوس کے لیے مدرسہ کا اوسط ایک نکلتا ہے۔

خواتین کے مدارس کا حال اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس وقت پورے

---

[1] کتاب کا پورا نام ہے جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان اس کی قیمت دس روپے ہے اور یہ جامعہ حنفیہ ٹرسٹ لائل پور، یا جامعہ حنفیہ ٹرسٹ محمد نگر، علامہ اقبال روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

مغربی پاکستان میں بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے جو ادارے کام کر رہے ہیں اُن کی تعداد اس جائزہ کے فاضل مرتبین کے اندازہ کے مطابق کل اٹھارہ ہے۔ اگر ہم اس تعداد کو دوگنا بھی کر لیں تو پھر بھی سوا لاکھ خواتین کے لیے صرف ایک مدرسہ قائم ہے۔

مردوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے دینی اداروں کی یہ قلت انتہائی تشویشناک ہے اور مسلم قوم کی بے حسی پر دلالت کرتی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ جس تعداد کو ہم بہت قلیل تیار ہے ہیں وہ انگریزی مدارس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ انگریزی سکولز اور کالجز ہمارے قومی نقطۂ نظر سے تعلیمی ادارے نہیں بلکہ صنعت و حرفت کی دوکانیں ہیں ہم اپنے بچوں کو ان اداروں میں تعلیم و تربیت کے لیے نہیں بھیجتے بلکہ اس غرض سے انہیں وہاں داخل کراتے ہیں کہ وہ روٹی کمانے کے قابل ہو جائیں۔ ان درسگاہوں کی وہی حیثیت ہے جو منڈی، کارخانے یا کھیت کی ہوتی ہے۔ ان کے خطرناک اثرات کو اگر ہم فی الحال نظر انداز بھی کر دیں تو پھر بھی ان کا زیادہ سے زیادہ مصرف نوخیز نسل کو سرکاری ملازمت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہمارے اس ملک میں ۵ فیصد لوگ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں میں اپنی روٹی کما رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان انگریزی مدارس کی بہت کم لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ ایک قوم کے تقریباً ایک تہائی افراد کماتے ہیں اور دو تہائی آبادی انہی کی کمائی پر انحصار کرتی ہے۔ اب اس ایک تہائی کا اگر پانچ فیصد معلوم کر لیا جائے تو پوری آبادی کے مقابلے میں اُن لوگوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے جنہیں ان درسگاہوں کی فی الحقیقت ضرورت درپیش ہے۔

دینی تعلیم کی حیثیت اس سے کہیں مختلف ہے۔ یہ روٹی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کی بنیاد اور اساس ہے اسی کے ذریعہ ہمارے اندر ایک ایسا رجحان یا اندازِ فکر پرورش پاتا ہے جو ہمیں سیرت و کردار

کے خاص سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اعتقادات و تصورات سے لیکر افعال و اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ہم دینی تعلیم کے محتاج ہیں جبتک ہم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے اور مرنے کا جذبہ موجود ہے اسی وقت تک ہم اس بات کو بھی جاننے کے خواہاں ہیں کہ ہمارے خدا اور اس کے رسول نے ہمیں کونسے احکام دیئے ہیں۔ زندگی کے کسی لمحہ میں ہم تعلیمات الٰہی سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اسی لئے جس طرح ہم اس دنیا میں ہوا اور پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ شدید ضرورت ہمیں دینی تعلیم کی ہے پھر یہاں ہندوؤں کی طرح تقسیم کار کا اصول بھی نہیں چل سکتا کہ کچھ لوگ دینی تعلیم حاصل کر لیا کریں اور باقی ان مقدس اور تعلیم یافتہ" انسانوں کی خدمت اور چاکری کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں اسلام میں ہر انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور کوئی دوسرا اس کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے حصول کو ہر مسلمان مرد اور عورت کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے

محولہ بالا گزارشات کی روشنی میں جو شخص بھی ان دینی اداروں کا مطالعہ کریگا وہ خود بخود ان کی زندگی کے راز کو پا سکتا ہے۔ غیر ملکی سامراج نے ان درسگاہوں کے ساتھ جو سوقیانہ سلوک کیا اور مسلمانوں کے امراء نے بالعموم ان کی طرف سے جو مجرمانہ تغافل برتا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن اس کے باوجود یہ محض تائید ایزدی سے آج تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا سرمایہ اخلاص ہے اور اسی کے بل بوتے پر وہ مصائب کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے ہیں حضرت مولانا قاسم علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھتے ہوئے جو رہنما اصول اس مدرسہ یا اس نوعیت کے دوسرے مدارس کو چلانے کے لیے رقم فرمائے وہ اس حقیقت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ توجہ الی اللہ کے سہارے اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور

کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگی"

مولانا علیہ الرحمہ نے سرکاری امداد اور امراء کی امداد کو بھی اس مقدس مشن کے لیے مضرقرار دیا ہے اور اس بات کی وصیت فرمائی ہے کہ تا حدالمقدور ایسے لوگوں سے چندہ لیا جاتے۔ جنہیں اس چندہ کی ادائیگی سے ناموری یا شہرت مطلوب نہ ہو بلکہ وہ اس فرض کو محض اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سرانجام دیں۔

جہاں ان مدارس کے چلانے میں یہ طرز فکر کارفرما ہو وہاں اساتذہ اور طلباء کے لیے معاشی خوشحالی اور فارغ البالی کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ جائزہ کے فاضل مرتب اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوتے فرماتے ہیں :

"مدارس عربیہ کے اساتذہ کی مالی حالت عموماً غیر تسلی بخش ہے جہاں سرکاری محکموں اور مروجہ محکمانہ ہائی سکول اور کالجوں کے اساتذہ کی بھاری بھرکم تنخواہیں سینکڑوں اور ہزاروں تک ہیں وہاں علمائے حق نانِ شعیر پر گذارہ کر رہے ہیں۔ کالجوں میں لیکچرار کی تنخواہیں اور الاؤنس تین صد کے قریب ہیں اور یونیورسٹی میں ریڈر اور پروفیسر آٹھ صد سے ہزار روپے تک پاتے ہیں۔ دوسری طرف دینی مدارس میں ایسے حضرات کی تعداد کم نہیں جو گھر سے کھا کر حسبتہ للہ درس دے رہے ہیں۔ اساتذہ میں متعدد ایسے حضرات بھی ہیں جو طلبا کی ضروریات کے کفیل بھی خود ہی ہیں۔ ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ اساتذہ کرام خود ہی مدارس اور دارالعلوم چلا رہے ہیں۔ قوم سے چندے وصول کرتے ہیں، قرض حسنہ لیتے ہیں، غرض جیسے بن آتا ہے انتظام کرتے ہیں۔ گویا تعلیم و تدریس کے ساتھ مالی وسائل پیدا کرنا بھی انہی کا ذمہ ہے اور وہ کسی انتظامی مجلس یا انجمن کے رہینِ منت نہیں ہوتے۔

عام طور پر دینی مدارس کے اساتذہ کے مشاہرے بیس تیس روپے سے شروع ہو کر سو ڈیڑھ سو تک ہوتے ہیں۔ مشاہرے کے علاوہ نہ کوئی مہنگائی الاؤنس ہے نہ کارپوریشن الاؤنس

ان اصحاب کے لیے عموماً کوئی گریڈ بھی مقرر نہیں ہوتا۔ معدودے چند دار العلوم اور بڑے مدارس کے جلیل القدر اساتذہ کو ڈھائی پونے تین سو کا مشاہرہ ملتا ہے لیکن ایسے ادارے چند ہی ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں ایک ادارے میں پندرہ بیس روپے ماہانہ وظیفہ پر اساتذہ تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی سے کیا بےنفسی اور فقر و غنا کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس مفلوک الحالی سے ان کے قلبی اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس صورتِ حال سے دس بیس انسان دو چار نہیں۔ اس جائزہ میں جن ۲۹۲ مدارس کے حالات درج ہیں اُن میں ۱۰۴۶ اساتذہ اس خدمت جلیلہ کو سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا کے ان مخلص بندوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو غیر ملکی سندات رکھتے ہیں اور اپنے فن میں ماہرین کہلانے کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔ پھر ان اساتذہ کرام کی ذہنی سطح اور تعلیمی استعداد بھی انگریزی مدارس کے معلّمین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے جائزہ کے مرتب فرماتے ہیں:

"دینی مدارس کے طلبا جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں ان کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہوتی ہے جو کچھ آج خود پڑھتے ہیں کل ہی دوسروں کو بلا تکلف فی تکلیف پڑھا سکتے ہیں۔ عام طور پر وہ اپنی مادر درسگاہ ہی میں بطور معلّم و مدرس تقرر حاصل کر لیتے ہیں اور نہایت کامیابی سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سرکاری اور محکمانہ نظام تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ کے سامنے نہ وہ احساس ہوتا ہے جو علمائے کرام کے دل میں ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں وہ شرح صدر حاصل ہوتی ہے جو علماء کو حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ سب کچھ بعینہٖ دوسروں کو پڑھا سکتے ہیں جو انہوں نے خود پڑھا ہوتا ہے۔ میٹرک پاس میٹرک کے طلبا کو ایف اے پاس ایف اے کے طلبہ کو اور بی اے پاس بی اے کی جماعت کو ہرگز نہیں پڑھا سکتے۔ الا ماشاء اللہ۔"

یہ تو ہیں مختصر الفاظ میں دینی مدارس کے روشن پہلو۔ لیکن صدیوں کے انحطاط نے ان کے اندر بعض ایسی خامیاں پیدا کر دی ہیں جن کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی چیز جو سارے علمائے دین

کے غور و فکر کی محتاج ہے۔ وہ دینی تعلیم کے مقصد کا تعین ہے۔" جائزہ[1] کے فاضل مرتب نے ایک سوالنامہ کے ذریعہ مختلف مدارس کے اربابِ بست و کشاد سے دریافت کیا کہ اُن کے نزدیک دینی تعلیم کا تخیل و مقصود کیا ہے اور کیا مروجہ نصاب وہ تخیل و مقاصد پورے کر رہا ہے؛ یہ سوال ۵۹۶ مدارس کو روانہ کیا گیا ہے اور ان میں سے ۲۱۳ نے اس کا جواب تحریر کیا۔ ان کی بھاری اکثریت نے اپنا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعتِ دین قرار دیا ہے۔ باقی نے بھی الفاظ کی تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ قریب قریب اسی چیز کو اپنا مقصد ٹھہرایا ہے۔

لیکن ان سب کا منتہائے مقصود ایک ہی ہونے کے باوجود ان کے مابین باہمی رقابت اور سر پھٹول اور طلبہ کے اندر جو تنگ نظری اور تعصب پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "اکثر اصحاب کے ذہن میں اشاعتِ دین کا تصور صرف اس حد تک ہے کہ مسلمانوں کے اندر مسائلِ دین کی اشاعت کی جائے یا باہم دوسرے مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کی تردید کی جائے۔ چنانچہ تین مدارس نے وضاحت سے اپنے مسلک کی وضاحت و اشاعت ہی کو مقصود و مطلوب بیان کیا۔ صرف ایک ادارہ کے منتظم نے غیر مسلموں میں تبلیغِ اسلام کو بطور مقصد پیش کیا۔ اور ایک دوسرے صاحب نے حفاظتِ دین کو مطمح نظر بیان فرمایا[1]"۔

فقہی مسلک کی تعلیم و تدریس بلاشبہ دینی تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے لیکن جس طرح اسے آج بنیاد بنا کر تعلیم کی پوری ترتیب الٹ دی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ فقہی مسائل میں تفقہ قرآن و سنت میں گہری بصیرت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن جب فقہ کو قرآن و سنت کے سمجھنے کا واحد ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر نقطۂ نظر بہت حد تک محدود ہو جاتا ہے اور تعلیماتِ الٰہی کے بہت سے گوشے کھل کر آنکھوں کے سامنے نہیں آتے فقہ کی اہمیت و ضرورت بہر حال مسلّم لیکن دین میں اسے قرآن و سنت کے برابر مقام دینا ہرگز درست نہیں۔ آخر سوچیے کہ ہمارے اسلاف میں فقہی اختلافات کے معاملے میں اتنی سختی اور شدت کیوں نہ تھی اور آج ہمارے درمیان جو شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس کی وجہ صرف یہی تو ہے کہ فقہ کو جس انداز سے ہمارے مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے اُس میں کوئی خامی ہے۔

دینی مدارس میں بعض اصحاب علم صرف، نحو اور معانی میں غرق ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی علم ہے۔ ایسے اہل علم کو نصیحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا:۔

[1] جائزہ

"یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے یا سنتِ ثابتہ ـــــ جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے مثلاً صرف نحو وغیرہ ان کو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو۔ علم کا پڑھنا تو اسی لیے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعائر اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔"

ہمارے ہاں درسِ نظامی میں شمولِ بعض کتابیں ـــ خصوصاً فلسفہ، منطق اور علم الکلام ـــــ اس قدر قدیم ہیں کہ وہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ رفتارِ زمانہ نے فلسفہ، معیشت، معاشرت، سیاست اور تمدن میں بعض ایسی نئی الجھنیں پیدا کر دی ہیں جنہیں قدیم فلسفہ اور علم الکلام سلجھا نہیں سکتا۔ ہمارے علماء اپنے علم و فضل کے باوجود نئے مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہماری نوخیز نسلیں خواہش و تمنا کے ہوتے ہوئے بھی علماء کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ تو سیاسی اور معاشرتی حالات کے تغیرات ہیں مگر دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے مابین ذہنی طور پر اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ جب تک علماء اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش نہیں کریں گے، وہ آنیوالی نسلوں کے دلوں میں اسلام کے لیے قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ انہیں اس کام کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

مگر اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اصلاحِ نصاب کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ مروجہ نصاب میں فلسفہ اور منطق کی پرانی کتابوں کو نکال کر اسی موضوع کی چند نئی کتب شامل کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ یہ سارے علوم اپنی پشت پر مادی تحریکات کی قوت رکھتے ہیں جنہیں اس وقت قبولِ عام حاصل ہے۔ لوگ ان سے مرعوب و مغلوب ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ انہیں شاملِ نصاب کرنے سے پہلے ان کا طلسم توڑا جائے۔

مغربی علوم و فنون کا سحر توڑنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ ساحرانِ فرنگ نے اپنی جادو بیانی کے زور سے افکار و نظریات کے جو طلسمات بنا رکھے ہیں اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے کے خلاف بطور دلیل استعمال کیا جائے۔ مغربی تصورات میں اس قدر تضاد ہے کہ ایک چیز اگر ہمیں تائید میں ملتی ہے تو بیسیوں اس کی تردید کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر چونکہ مغرب اس وقت الہامی تعلیم سے یکسر بے نیاز ہو کر آگے بڑھ رہا ہے

اس لیے اس کے معتقدات میں کوئی ٹھہراؤ اور ثبات نہیں۔ وہ آج اگر ایک مسئلہ کے حق میں کہہ رہا ہے تو کل اس کے خلاف بیان کرنا شروع کر دیگا۔ صبح اگر اس کی ایک رائے ہے تو شام کو وہ یکسر بدل جائے گی۔ اس بنا پر اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ مغربی افکار و تصورات کا پوری طرح جائزہ لیا جائے اور پھر قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی تردید ہو۔ یہ کام بڑا محنت طلب اور صبر آزما ہے اس میں قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی لیکن امتِ مسلمہ جب تک اسے کامیابی سے سرانجام نہیں دیتی اس وقت تک اس کے لیے نوخیز نسل کو الحاد سے بچانا ممکن نہیں۔ ہمیں اس وقت ان مغرب پرستوں کی ضرورت نہیں جو یورپ سے آئی ہوئی ہر بات کی قرآن پاک سے تائید کرنے کے درپے ہوں۔ یہ خدمتِ دین نہیں بلکہ تحریفِ دین ہے اور اس سے نہایت خطرناک نتائج پیدا ہونے کی توقع ہے۔

مغربی افکار و تصورات کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے اُن کے اندر اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو یہ کوئی خطرناک بات نہیں سمجھی جاتی۔ یورپ کا ہر ذہین نوجوان جانتا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ میں تغیرات ہو سکتے ہیں اس لیے اُن کے نزدیک افکار کی تبدیلی اُن کے ایمان کو متزلزل نہیں کرتی لیکن ہمارے ہاں اگر یہ روش اختیار کر لی گئی تو پھر ایمان کی خیر نہیں۔ آج جن مغربی افکار کی تائید میں ہم قرآن پاک کو تکلّفاً گواہ بنا رہے ہیں کل اگر وہ بدل گئے یا اُن کی خامیاں سطح پر آجانے کے بعد لوگوں نے انہیں ترک کر دیا تو اس "مقدس گواہ" کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ ہر صاحبِ عقل بآسانی کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ روش سرے سے ہی غلط ہے اور اسے کم از کم دینی مدارس کے اندر اختیار نہ کرنا چاہیے۔ ہم آج مغرب پرست مسلم مفکرین کی خدمات کے محتاج نہیں بلکہ کسی غزالی کے منتظر ہیں جو اپنی قوت فکر و عمل سے مغرب کا طلسم توڑ سکے۔

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۳)

اور[۸۰] اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے[۸۱] — سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے

---

۸۰ واضح رہے کہ آگے چل کر اسی سورہ میں ہجرت کی تلقین کی جارہی ہے۔ اُس وقت حبش ہی ایک ایسا مامن تھا جہاں مسلمان ہجرت کرکے جاسکتے تھے۔ اور حبش پر اُس زمانے میں عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے ان آیات میں مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو ان سے دین کے معاملہ میں بحث و کلام کا کیا انداز اختیار کریں۔

۸۱ یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جارہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہوسکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ نہ بڑھ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہوجائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغِ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ — دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور

ظالم ہوں ؎۵۲ ۔ اور اُن سے کہو کہ "ہم ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مُسلم (فرمانبردار) ہیں" ؎۵۳ (اے نبی) ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے ؎۵۴۔ اس لیے

الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل۔ رکوع ۱۶)

عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حٰم السجدہ رکوع ۵)

بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۔ (المومنون۔ رکوع ۶)

تم بدی کو اچھے ہی طریقہ سے دفع کرو، ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ (الاعراف۔ رکوع ۲۴)

درگزر کی روش اختیار کرو، بھلائی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو، اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔

؎۵۲ یعنی جو لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رویہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلہ میں نرم و شیریں ہی نہ رہنا چاہیے کہ دنیا داعیِ حق کی شرافت کو کمزوری اور مسکنت سمجھ بیٹھے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو شائستگی، شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ وہ ہر ظالم کے لیے نرم چارہ بن کر رہیں۔

؎۵۳ ان فقروں میں اللہ تعالیٰ نے خود اُس عمدہ طریقِ بحث کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغِ حق کی خدمت انجام دینے والوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمہیں بحث کرنی ہو اُس کی گمراہی کو بحث کا نقطۂ آغاز نہ بناؤ، بلکہ بات اس سے شروع کرو کہ حق و صداقت کے وہ کون سے اجزاء

وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں[۸۵]، اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے

ہیں جو تمہارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں یعنی آغازِ کلام نکاتِ اختلاف سے نہیں بلکہ نکاتِ اتفاق سے ہونا چاہیے، پھر انہی متفق علیہ امور سے استدلال کر کے مخاطب کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جن امور میں تمہارے اور اس کے درمیان اختلاف ہے ان میں تمہارا مسلک متفق علیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔ اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہلِ کتاب مشرکینِ عرب کی طرح وحی و رسالت اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح ان سب حقیقتوں کو مانتے تھے۔ ان بنیادی امور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیادِ اختلاف ہو سکتی تھی تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے ہاں آئی ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی انہیں دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انہیں کافر قرار دیتے۔ یہ جھگڑے کی بڑی معقول وجہ ہوتی۔ لیکن مسلمانوں کا موقف اس سے مختلف تھا وہ تمام ان کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہلِ کتاب کے پاس موجود تھیں اور پھر اس وحی پر ایمان لائے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ بتانا اہلِ کتاب کا کام تھا کہ کس معقول وجہ سے وہ خدا ہی کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہلِ کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا یہی موقف ان کے سامنے پیش کرو۔ ان سے کہو کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی کو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔ اس کی طرف سے جو احکام و ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں ان سب کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے، خواہ وہ تمہارے ہاں آئی ہوں یا ہمارے ہاں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ملک اور قوم اور نسل کے بندے نہیں ہیں کہ ایک جگہ خدا کا حکم آئے تو ہم مانیں اور اسی خدا کا حکم دوسری جگہ آئے تو ہم اس کو نہ مانیں۔

۸۴ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح پہلے انبیاء پر ہم نے کتابیں نازل کی تھیں اسی طرح اب یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اسی تعلیم کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے کہ ہماری پچھلی کتابوں کا انکار کر کے نہیں بلکہ ان سب کا اقرار کرتے ہوئے اسے مانا جائے۔

۸۵ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد تمام اہلِ کتاب نہیں ہیں بلکہ وہ اہلِ کتاب ہیں جن کو کتبِ الٰہیہ کا صحیح علم و فہم نصیب ہوا تھا، جو "چارپائے بروکتابے چند" کے مصداق محض کتاب بردار

اس پر ایمان لا رہے ہیں[۸۶]، اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں[۸۷]۔

(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے[۸۸]۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں

قسم کے اہلِ کتاب نہیں تھے، بلکہ حقیقی معنی میں اہلِ کتاب تھے۔ ان کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہوئی یہ آخری کتاب آئی تو انہوں نے کسی ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصب سے کام نہ لیا اور اسے بھی ویسے ہی اخلاص کے ساتھ تسلیم کر لیا جس طرح پچھلی کتابوں کو تسلیم کرتے تھے۔

۸۶ "ان لوگوں" کا اشارہ اہلِ عرب کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق پسند لوگ ہر جگہ اس پر ایمان لا رہے ہیں خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا غیر اہلِ کتاب میں سے۔

۸۷ یہاں کافر سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے تعصبات کو چھوڑ کر حق بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، یا وہ جو اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنی بے لگام آزادیوں پر پابندیاں قبول کرنے سے جی چراتے ہیں اور اس بنا پر حق کا انکار کرتے ہیں۔

۸۸ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں وہی استدلال ہے جو اس سے پہلے سورۂ یونس اور سورۂ قصص میں گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ یونس حاشیہ ۲۱ و تفسیر سورۂ قصص حاشیہ ۶۴۔ اس مضمون کی مزید تشریح کے لیے تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ نحل حاشیہ ۱۰۷، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۵، المومنون حاشیہ ۶۶، اور الفرقان حاشیہ ۱۲ کا مطالعہ بھی مفید ہو گا)۔

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ آپ کے اہلِ وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اسی امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو

اُن لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے[۹۰]، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں[۹۱] اس کے رب کی طرف سے؟" کہو، "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر"۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے[۹۲]

وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمّیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔

۹۰ یعنی ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی اُن کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں اور نہ گرد و پیش کے اُن ممالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں کہیں دور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر آتی ہو تو نہ آئے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے

ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

۸۹ یعنی معجزات جنہیں دیکھ کر یقین آئے کہ واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے نبی ہیں۔

۹۰ یعنی امّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا۔ کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے وہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔

قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور شہادت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ لکھے پڑھے تھے، یا بعد میں آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک، بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (یعنی حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علی نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیئے اور محمد بن عبد اللہ لکھ دیا۔ لیکن یہ روایت براء بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں۔ بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال لعلی امحہ فقال علی ما انا بالذی امحاہ فمحاہ رسول اللہ بیدہ (حضورؐ نے حضرت علی سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخرکار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انہیں کاٹ دیا)۔ اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول اللہ قال لا واللہ لا امحوک ابداً۔ فاخذ رسول اللہ الکتاب فکتب ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد بن عبد اللہ۔ (پھر علی سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے

نے کہا خدا کی قسم میں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے تحریر لیکر لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ نے طے کیا۔ تیسری روایت انہی براء بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلی امح رسول اللہ فقال علی واللہ لا امحاہ ابداً قال فارنیہ قال فاراہ ایاہ فمحاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ (حضور خود نہ لکھ سکتے تھے۔ آپ نے حضرت علی سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹونگا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپ کو جگہ بتائی اور آپ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیئے)۔ چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکتاب ولیس یحسن یکتب فکتب ھذا ما قاضیٰ محمد بن عبد اللہ (پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی درآنحالیکہ آپ لکھنا نہ جانتے تھے اور آپ نے لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ نے طے کیا)۔ انہی براء بن عازب سے دو روایتیں مسلم کتاب الجہاد میں منقول ہیں جن میں سے ایک میں یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا دیئے اور دوسری میں یہ کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں لکھا ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی، اور آپ نے اسے مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ روایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے "محمد بن عبداللہ" کے الفاظ اپنے دست مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹانے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے اس کی جگہ ان سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبداللہ کے الفاظ لکھوا دیئے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علی، دوسرے محمد بن مسلمہ (فتح الباری، جلد ۵، ص ۲۱۷)۔ اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت ابن ابی شیبہ اور عمر بن شبہ نے مجاہد کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ ما مات رسول اللہ

درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ۹۲ ع (اے نبی) کہو کہ
میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ
جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔
یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں ۹۳ اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب
آ چکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آ کر رہے گا اچانک، اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی
یہ عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں، حالانکہ جہنم کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے (اور انہیں پتہ
چلے گا) اس روز جبکہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانک لیگا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور
کہیگا کہ اب چکھو مزا اپنے کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ
چکے تھے)۔ لیکن اوّل تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں فضعیف
لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یوں بھی واضح ہے کہ اگر حضور نے فی الواقع بعد میں لکھنا پڑھنا سیکھا
ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے
کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عون بن عبداللہ کے، جن سے مجاہد نے
یہ بات سنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عون بھی صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً
یہ نہیں بتایا کہ انہیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعہ کا علم حاصل ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور
روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

۹۲ یعنی جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت مان لیں اور قرآن کی ہدایت قبول کر لیں وہ خود اللہ کی
رحمت اور اس کی نصیحت سے مستفید ہونگے۔ اور جو اسے نہ مانیں وہ خود ہی نقصان اٹھائیں گے۔

۹۳ یعنی بار بار چیلنج کے انداز میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر تم رسول ہو اور ہم واقعی حق کو جھٹلا رہے ہیں
تو ہم پر وہ عذاب کیوں نہیں لے آتے جس کے ڈراوے تم ہمیں دیا کرتے ہو۔

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔ ۹۴
ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ ۹۵ جو لوگ
ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے
جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے
لیے ۹۶ — اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے ۹۷ اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ۹۸ ۔ کتنے

۹۴؎ یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات ماردیگا۔ جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دیگا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محب قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پہ دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دیگا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

۹۵؎ یعنی جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائق فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا، اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہوا ایمان، یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

۹۶؎ یعنی اگر ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی

بہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے
وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۹۹

نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہوگی اور نری تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا۔

۹۷ یعنی جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہیں جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہے اور منہ نہیں موڑ لیا ہے۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات تک نہیں کیا ہے۔ کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی ہے۔

۹۸ یعنی جنہوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا ہے کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہوگا، وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دنیا میں بھی دستگیری فرماتے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیگا۔

۹۹ یعنی ہجرت کرنے میں تمہیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم بھی یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمہیں بھی دیگا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمائی تھی۔ انہوں نے فرمایا:
"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھیگا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟

تنزیلہ
اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو

ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو تم کو کیوں نہ پہنائے گا۔ اس لیے فکرمند نہ ہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ ان سب چیزوں کی تلاش میں تو غیر قومیں رہتی ہیں۔ تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو۔ یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔ کل کے لیے فکر نہ کرو۔ کل کا دن اپنی فکر آپ کر لیگا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔" (متی۔ باب ۶۔ آیات ۲۴۔ ۳۴)

قرآن اور انجیل کے ان ارشادات کا پس منظر ایک ہی ہے۔ دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کے حالات بدلتے ہی ان لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لیکر اٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انہی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کہو، الحمدللہ[۱۰۱] مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں ع

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا[۱۰۲]۔ اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت

۱۰۰ یہاں سے پھر کلام کا رُخ کفارِ مکہ کی طرف مُڑتا ہے

۱۰۱ اس مقام پر الحمدللہ کا لفظ دو معنی دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ جب یہ سارے کام اللہ کے ہیں تو پھر حمد کا مستحق بھی صرف وہی ہے، دوسروں کو حمد کا استحقاق کہاں سے پہنچ گیا۔ دوسرے یہ کہ خدا کا شکر ہے، اس بات کا اعتراف تم خود بھی کرتے ہو۔

۱۰۲ یعنی اس کی حقیقت بس اتنی ہی سی ہے جیسے بچے تھوڑی دیر کے لیے کھیل کود لیں اور پھر اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔ یہاں جو بادشاہ بن گیا ہے وہ حقیقت میں بادشاہ نہیں بن گیا ہے بلکہ صرف بادشاہی کا ڈراما کر رہا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اس کا یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور اسی بے سروسامانی کے ساتھ وہ تختِ شاہی سے رخصت ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ اسی طرح زندگی کی کوئی شکل بھی یہاں مستقل اور پائیدار نہیں ہے۔ جو جس حال میں بھی ہے عارضی طور پر ایک محدود مدت کے لیے ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی کامرانیوں پر جو لوگ مرے مٹتے ہیں اور انہی کے لیے ضمیر و ایمان کی بازی لگا کر کچھ عیش و عشرت کا سامان اور کچھ شوکت و حشمت کے ٹھاٹھ فراہم کر لیتے ہیں ان کی یہ ساری حرکتیں دل کے بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ ان کھلونوں سے اگر وہ دس بیس یا ساٹھ ستر سال دل بہلا لیں اور پھر موت کے دروازے سے خالی ہاتھ گزر کر اُس عالم میں پہنچیں جہاں کی دائمی و ابدی زندگی میں ان کا یہی کھیل بلائے بے درماں ثابت ہو تو آخر اس طفل تسلی کا فائدہ کیا ہے؟

ہے، کاش یہ لوگ جانتے[۱۰۳]۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفرانِ نعمت کریں اور (حیاتِ دنیا کے) مزے لوٹیں[۱۰۴]۔ اچھا، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں[۱۰۵]؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو[۱۰۶]۔ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم ہی نہیں ہے؟ جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم

---

[۱۰۳] یعنی اگر یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے کہ دنیا کی موجودہ زندگی صرف ایک مہلتِ امتحان ہے، اور انسان کے لیے اصل زندگی، جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، آخرت کی زندگی ہے، تو وہ یہاں امتحان کی مدت کو اس لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے اس کا ایک ایک لمحہ اُن کاموں میں استعمال کرتے جو اُس ابدی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔

[۱۰۴] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ انعام حاشیہ ۲۹ و ۴۱، سورۂ یونس حاشیہ ۲۹ و ۳۱، سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۸۴۔

[۱۰۵] یعنی کیا ان کے شہر مکہ کو، جس کے دامن میں انہیں کمال درجے کا امن میسر ہے، کسی لات یا ہُبل نے حرم بنایا ہے؟ کیا کسی دیوی یا دیوتا کی یہ قدرت تھی کہ ڈھائی ہزار سال سے عرب کی انتہائی بدامنی کے ماحول میں اس جگہ کو تمام فتنوں اور فسادوں سے محفوظ رکھتا؟ اس کی حرمت کو برقرار رکھنے والے ہم نہ تھے تو اور کون تھا؟

[۱۰۶] یعنی میں نے دعوائے رسالت کیا ہے اور تم نے اسے جھٹلایا ہے۔ اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ اگر میں نے اللہ کا نام لیکر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر تم نے سچے نبی کی تکذیب کی ہے تو پھر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔

ع۶ اپنے راستے دکھائیں گے،[۱۰۶] اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔ ع

[۱۰۶] "مجاہدہ" کی تشریح اسی سورۂ عنکبوت کے حاشیہ ۸ میں گزر چکی ہے۔ وہاں یہ فرمایا گیا تھا کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا وہ اپنی ہی بھلائی کے لیے کرے گا (آیت ۶)۔ یہاں یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دنیا بھر سے کشمکش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ وہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لیے کھول دیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر انہیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر ہر موڑ پر انہیں روشنی دکھاتا ہے کہ راہِ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں۔ جتنی نیک نیتی اور خیر طلبی ان میں ہوتی ہے اتنی ہی اللہ کی مدد اور توفیق اور ہدایت بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔

منصبِ نبوّت

صحیح اور غلط تصوّر کا فرق

[ماہ جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں سنّت کی آئینی حیثیت کے متعلق ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کی جو مراسلت شائع ہوئی تھی، اس کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خط وصول ہوا ہے، جسے ذیل میں مدیر ترجمان القرآن کے جواب کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔ اس بحث سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے مناسب ہوگا کہ قارئین کرام ابتدائی مراسلت کو بھی نگاہ میں رکھیں۔]

ڈاکٹر صاحب کا خط

مولانائے محترم! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۸۔ اگست ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد بات ذرا اطمینان سے ہو سکے گی۔ آپ نے اپنے خط مورخہ ۲۶ جون میں میرے پہلے سوال کے جواب کے اختتام پر فرمایا تھا۔

دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیئے تھی کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں اور کام کیا تھا یا نہیں اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں!

نیز یہ بھی کہ:

پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ آیا سنت رسول اللہ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون مانتے ہیں یا نہیں؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے موجودہ خط میں مسئلہ زیر بحث کے صرف اسی حصّہ پر گفتگو کروں

اور اس کے باقی اجزاء آئندہ کے لیئے ملتوی کر دوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے اوّلین خط مؤرخہ ۲۱ مئی میں صاف طور پر یہ عرض کیا تھا کہ

"مجھے تو سنت کی تحقیقی اہمیت سے مجالِ انکار ہے اور نہ اس کی اہمیت کو ختم کرنا مقصود"

چنانچہ آپ کا یہ سوال کہ میرے نزدیک سنت رسول اللہ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ غیر ضروری ہے۔ البتہ میرے نزدیک سنت کا مفہوم آپ سے مختلف ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ آیا میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتا ہوں یا نہیں ــ ؟ ــ میرا جواب نفی میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ اجازت دیجیے کہ میں پہلے اس بات کو صاف کر لوں کہ آیا رسول اللہ نے قرآن سنا دینے کے سوا دنیا میں کوئی کام کیا تھا یا نہیں؟ اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں؟ ــ جب اسکا جواب سامنے آجائیگا۔ تو دلیل خود بخود سامنے آجائیگی۔

مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلّم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی۔ اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ! لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے"۔ بے شک حضور نے حاکم اعلےٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا۔ اور جو کچھ حضور نے عملاً کیا اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ میرے نزدیک وحی پانے کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ لیکن رسالت کے فرائض جو حضورؐ نے سر انجام دیئے ان کا مقصد یہ تھا کہ حضورؐ کے بعد بھی انہیں خطوط پر معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے اور یہ تسلسل قائم رہے۔ اگر حضورؐ نے مَا اَنْزَلَ اللہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ مَا اَنْزَلَ اللہ کو دوسروں تک پہنچائے اگر حضورؐ نے مَا اَنْزَلَ اللہ کے مطابق جماعت بنائی ریاست قائم کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ انہی خطوط پر عمل کرے اگر حضور نے مَا اَنْزَلَ اللہ کے

مطابق معاملات کے فیصلے کئے تو امت بھی مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق فیصلے کرے۔ اگر حضورؐ نے "شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ" کے مطابق امورِ سلطنت میں مشاورت سے کام لیا تو امت بھی ایسا ہی کرے۔ اگر حضورؐ نے نبوت کے تئیس سال غزوات میں گھوڑے کی پیٹھ پر گذارے تو امت بھی انہی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر جنگ کرے۔ چنانچہ مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق تربیت، جماعت بندی، ریاست کا قیام، مشاورت، قضا، غزوات۔ یہ سارے کام امت کرے تو یہ سنت رسول اللہ ہی کی پیروی ہے۔ حضورؐ نے بھی اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مَا اَنْزَلَ اللّٰہ پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کی۔ اور سنت رسول اللہ کی پیروی یہ ہے کہ ہر زمانے کی امت، زمانے کے تقاضوں کے مطابق مَا اَنْزَلَ اللّٰہ پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کرے۔ موجودہ وقت میں ہم جو بھی طرزِ حکومت، حالات اور موجودہ تقاضوں کے مطابق مناسب سمجھیں عمل میں لائیں۔ لیکن مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر۔ یہی سنت رسول اللہ پر عمل ہوگا۔ اگر ہم ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جو مَا اَنْزَلَ اللّٰہ نے متعین کئے ہیں جنگیں لڑیں تو یہی سنت رسول اللہ پر عمل ہوگا۔ لیکن اگر جیسے کہ ایک مقامی اخبار میں ایک مولوی صاحب نے گذشتہ ہفتہ لکھا تھا کہ حضرت عمرؓ کی فوج کو ایک قلعہ فتح کرنے میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ فوج نے کئی دن مسواک نہیں کی تھی یا یہ کہ آج کے ایٹمی دور میں جنگ کے اندر تیروں کا استعمال ہی ضروری ہے کیونکہ حضورؐ نے جنگوں میں تیر استعمال کئے تھے تو اس سے بڑھ کر سنت رسول اللہ سے مذاق کیا ہو سکتا ہے۔ ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کئے وہ اسی مَا اَنْزَلَ اللّٰہ کا جو کتاب اللہ میں موجود ہے اتباع کرتے تھے اور امت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (۷/۳) کہہ کر امت کے افراد کو تلقین کی وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضورؐ بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (۷/۲۰۳)۔ نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں کم از کم میرے لئے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسانوں کی رہنمائی کے لئے

صرف ایک ضابطۂ قوانین کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلکہ اس کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کی ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ اور پھر معاملاتِ زندگی میں فیصلوں کے لئے اس ضابطۂ حیات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، اور یہ بھی واضح طور پر اعلان کر دیا کہ یہ ضابطہ قانون مفصل ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) بلکہ مومن اور کافر کے درمیان تمیز یہ رکھدی کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) کیا قرآن کریم کو کِتٰبٌ عَزِيْزٌ (ایک غالب کتاب) کہکر نہیں پکارا گیا۔ کیا تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۶) کا اعلان یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ قانون خداوندی مکمل ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ باقی رہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔ کافر بھی تو اس کتاب کے علاوہ کوئی چیز اپنی تسلی کے لئے چاہتے تھے جب اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ کیا یہ کتاب ان کے لئے کافی نہیں؟ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اِنَّآ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ[1] الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱)

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق۔ اس لئے نظام کو قائم رکھنے کے لئے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو۔ وہاں پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے کیونکہ پیغام اس نے اس لئے پہنچایا کہ وحی اس کے سوا اور کسی کو ملتی نہیں۔ چنانچہ قرآن نے اسی لئے واضح کر دیا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ چنانچہ حضورؐ مرکزِ ملت بھی تھے۔ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اسی نکتہ کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴) ظاہر ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ (اگر اسکا مقصد وعظ و نصیحت نہیں) اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ سنتِ رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے مرکزِ ملت کے قیام کو مسلسل عمل میں لایا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس ضابطہ قانون پر چلانا حضورؐ کا مقصد تھا اور آئندہ مرکزِ ملت کا مقصد رہے گا۔ اس ضابطہ قانون کو نامکمل قرار دے دیا جائے۔

---

[1] صحیح عبارت اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ ہے۔

آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے اُن میں آنحضرت کی پوزیشن کیا تھی؟

میرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشری حیثیت سے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کر کے دکھایا میرا یہ جواب کہ حضورؐ کے فرائض رسالت کی سرانجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اسکا ثبوت ملتا ہے حضورؐ نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضورؐ نظام مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰) اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آجاتی۔ جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے دے دی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِیْنَ (۹/۴۳) اسی طرح سورۂ تحریم میں تادیب آگئی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۱) اسی طرح سورۂ عبس میں ہے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی (۸۰/۱-۱۰)

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ وحی کی روشنی میں امورِ سلطنت کی سرانجام دہی میں جزئی معاملات میں حضورؐ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ان امور کو ایک بشر کی حیثیت سے سرانجام دیتے تھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دو نتائج لازماً پیدا ہوتے۔ اولاً یہ تصور کہ چونکہ حضورؐ نے جو کچھ کیا وہ ایک نبی کی حیثیت سے کیا اسلئے عام انسان ان کو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آج بھی مایوسی کے عالم میں بعض جگہ یہ تصور پایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا وہ عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔ اور وہ دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصور بجائے خود سنّت رسول اللہ کی پیروی کی نفی ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ تصور ہو سکتا ہے کہ اس لئے حضورؐ کے بعد نبیوں کے آنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ پھر سے اس قسم کا معاشرہ قائم کر سکیں (چونکہ عام انسان ایسا نہیں کر سکتے)۔ آپ خود سوچئے کہ یہ دونوں نتائج کس قدر خطرناک ہیں۔ جو اس تصور

کے نتیجہ کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ حضور نے جو کچھ بھی کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا ختم نبوت انسانیت کے سفر زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں سے شخصیتوں کا دور ختم ہوتا ہے اور اصول و اقدار کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تصور کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا ختم نبوت کے اصول کی تردید کے مترادف ہے۔ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُول ... (۳/۱۴۴) جیسی واضح آیات کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے وحی کی رو سے کرتے تھے (اور وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا) اس بات کا اعلان ہے کہ حضور کی وفات کے بعد دین کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی الکتٰب کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کر لیتے۔ اور اگر نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا۔ اور اسی کو حضور کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباع سنت رسول اللہ ہے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وحی کی رو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلی نہ ہوئی چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا، یہ دوسری وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزولِ قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کسی آیت کی طرف اشارہ

فرما سکیں تو مشکور ہوں گا۔ والسلام

مخلص

عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ مورخہ ۷؍ اگست ملا۔ اس تازہ عنایت نامے میں آپ نے اپنے پیش کردہ ابتدائی چار سوالات میں سے پہلے سوال پر بحث کو محدود رکھتے ہوئے نبوت اور سنت کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کا تصورِ نبوت ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی میں غلطی موجود ہو تو بعد کے اُن سوالات پر جو اسی بنیاد سے اُٹھتے ہیں بحث کر کے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ میرے جواب پر مزید سوالات اٹھانے کے بجائے ان اصل مسائل پر گفتگو فرمائیں جو میں نے اپنے جواب میں بیان کیے ہیں۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری اس گزارش کو قبول کر کے اولین بنیادی سوال پر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ اب میں آپ کی، اور اُن دوسرے لوگوں کی جو اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔

نبوت اور سنت کا جو تصور آپ نے بیان کیا ہے وہ قرآن مجید کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ آپ نے اس ناقص مطالعہ پر اتنا اعتماد کر لیا کہ پہلی صدی سے آج تک اس بارے میں ساری امت کے علماء اور عوام کا بالاتفاق جو عقیدہ اور عمل رہا ہے اسے آپ غلط سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے نزدیک یہ خیال کر لیا ہے کہ پونے چودہ سو سال کی طویل مدت میں تمام مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے منصب کو سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں، ان کے تمام علمائے قانون نے سنت کو ماخذِ قانون ماننے میں غلطی کی ہے، اور ان کی تمام سلطنتیں اپنا قانونی نظام

اس بنیاد پر قائم کرنے میں غلط فہمی کی شکار ہوگئی ہیں۔ آپ کے ان خیالات پر تفصیلی گفتگو تو میں آگے کی سطور میں کروں گا، لیکن اس گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹھنڈے دل سے اپنے دینی علم کی مقدار کا خود جائزہ لیں اور خود ہی سوچیں کہ وہ علم جو آپ نے اس بارے میں حاصل کیا ہے کیا وہ اتنے بڑے زعم کے لیے کافی ہے؟ قرآن تنہا آپ ہی نے تو نہیں پڑھا ہے۔ کروڑوں مسلمان ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر حصے میں اس کو پڑھتے رہے ہیں۔ اور بے شمار ایسے لوگ بھی اسلامی تاریخ میں گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جن کے لیے قرآن کا مطالعہ ان کے بہت سے مشاغل میں سے ایک ضمنی مشغلہ نہیں رہا ہے بلکہ انہوں نے اپنی عمریں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں صرف کر دی ہیں۔ آخر آپ کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہوگئی کہ نبوت جیسے بنیادی مسئلے میں یہ سب لوگ قرآن کا منشا بالکل الٹا سمجھ بیٹھے ہیں اور صحیح منشا صرف آپ پر اور آپ جیسے چند اصحاب پر اب منکشف ہوا ہے۔ پوری تاریخ اسلام میں آپ کسی ایک قابلِ ذکر عالم کا بھی نام نہیں لے سکتے جس نے قرآن سے منصبِ نبوّت کا وہ تصور اخذ کیا ہو جو آپ بیان کر رہے ہیں اور سنت کی وہ حیثیت قرار دی ہو جو آپ قرار دے رہے ہیں۔ اگر ایسے کسی عالم کا حوالہ آپ دے سکتے ہیں تو براہِ کرم اس کا نام لیجیے۔

۱۔ منصبِ نبوت اور اس کے فرائض آپ کی عقل و ضمیر سے یہ مخلصانہ اپیل کرنے کے بعد اب میں آپ کے پیش کردہ خیالات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ آپ کی ساری بحث دس نکات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا نکتہ خود آپ کے الفاظ میں یہ ہے:

> "مجھے آپ سے سو فی صدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی۔ اور پھر ایک ریاست قائم کی۔"

یہ سو فی صدی اتفاق جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، دراصل ایک فی صدی، بلکہ ۱۔۱

فی صدی بھی نہیں ہے" اس لیے کہ آپ نے حضور کو محض معلم، حاکم، قاضی وغیرہ مانا ہے مامور من اللہ کی لازمی صفت کے ساتھ نہیں مانا ہے۔ حالانکہ سارا فرق اسی صفت کے ماننے اور نہ ماننے سے واقع ہوتا ہے۔ آگے چل کر آپ نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے کام رسول کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت میں تھے اور اسی وجہ سے اس حیثیت میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے اسے آپ وہ سنت نہیں مانتے جو ماخذِ قانون ہو۔ دوسرے الفاظ میں آنحضورؐ آپ کے نزدیک ایک معلم تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دنیا میں اور استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک حضورؐ بھی تھے۔ اسی طرح آپؐ قاضی تھے، مگر خدا نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح ایک جج یا مجسٹریٹ آپؐ بھی تھے۔ یہی پوزیشن حاکم اور مرکزی اور قائد و رہنما کے معاملہ میں بھی آپ نے اختیار کی ہے کہ ان میں سے کوئی منصب بھی آپ کے خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے حاصل نہ تھا۔"

پہلا سوال یہ ہے کہ پھر یہ مناصب حضور کو حاصل کیسے ہوئے۔ کیا مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں نے باختیار خود آپؐ کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا اور اس قیادت کے منصب سے وہ آپؐ کو ہٹا دینے کے بھی مجاز تھے؟ کیا مدینہ پہنچ کر جب اسلامی ریاست کی بنا ڈالی گئی اُس وقت انصار و مہاجرین نے کوئی مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائد اعلیٰ ہوں گے؟ کیا حضور کی موجودگی میں کوئی دوسرا مسلمان بھی ان مناصب کے لیے منتخب ہو سکتا تھا؟ اور کیا مسلمان اس کے مجاز تھے کہ آپؐ سے یہ سب مناصب، یا ان میں سے کوئی منصب واپس لے کر باہمی مشورے سے کسی اور کو سونپ دیتے؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینے کی اس ریاست کے لیے قرآن کے تحت تفصیلی قوانین اور ضابطے بنانے کی غرض سے کوئی

یجسلیچر حضورؐ کے زمانہ میں قائم کی گئی تھی جس میں آپؐ صحابہ کے مشورے سے قرآن کا منشا معلوم کرتے کی کوشش کرتے ہوں اور اس مجلس کی رائے سے قرآن کا جو مفہوم متعین ہوتا ہو اس کے مطابق ملکی قوانین بنائے جاتے ہوں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو براہِ کرم اس کا کوئی تاریخی ثبوت ارشاد فرمائیں۔ اور اگر نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے۔ تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود رہنما، فرمانروا، قاضی، شارع اور قائدِ اعلیٰ بن بیٹھے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی جو حیثیت آپ قرار دے رہے ہیں کیا قرآن بھی آپؐ کی وہ حیثیت قرار دیتا ہے؟ اس سلسلہ میں ذرا قرآن کھول کر دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

رسولؐ بحیثیت معلّم و مربّی | اس کتاب پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرہ - آیت ۱۲۹)	اور یاد کرو جبکہ ابراہیم اور اسماعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (انہوں نے دعا کی) ... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔
كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ - آیت ۱۵۱)	جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔
لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ

بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران - ۱۶۴)	ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔
هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ ۔ ۲)	وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو بتاکید دہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف آیاتِ قرآن سنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔ ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشو ونما دیں۔ ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی، ورنہ اس کا الگ ذکر کرنا بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اب فرمائیے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مربی کے مناصب جو حضور کو حاصل تھے ان پر آپ خود فائز ہو بیٹھے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتائیے کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باتیں حضورؐ نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو ترتیب حضورؐ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسولؐ بحیثیت شارح کتاب اللہ | سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْہِمْ (آیت ۴۴)

اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے ان کی آپؐ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کی توضیح و تشریح محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی، بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے، اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (PRACTICAL DEMONSTRATION) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفلِ مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب فرمائیے کہ اس آیت کی رُو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپؐ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے۔ پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارحِ قرآن کی حیثیت سے آپؐ کے منصب کو رسالت کے منصب سے

الگ قرار دیا جاتے اور آپ کے پہنچاتے ہوئے الفاظِ قرآن کو لیکر آپ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جاتے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہوگا؟

رسول بحیثیتِ پیشوا و نمونۂ تقلید | سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ . . . قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آیات ۳۱-۳۲)

(اے نبی) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کریگا . . . کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (آیت ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونۂ تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے۔ ان کی زندگی کو نمونۂ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضورؐ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپؐ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپؐ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضورؐ کو مامور من اللہ رہنما و پیشوا قرار دے رہے ہیں، تو پھر آپؐ کی پیروی اور آپؐ کے نمونۂ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔ اگر یہ مراد ہوتی تو فَاتَّبِعُوا الْقُرْاٰنَ فرمایا جاتا نہ کہ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ اور اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

رسول بحیثیتِ شارع | سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (آیت ۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی (LEGISLATIVE) اختیارات عطا کیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے، بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے؛ وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورۂ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (آیت ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جاسکتی کہ ان میں قرآن کے امر و نہی اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہوگی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہوگئی، آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے گئے؟

رسول بحیثیتِ قاضی | قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ (النساء - ۱۰۵)	(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔
وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۔ (الشوریٰ ۱۵)	اور (اے نبی، کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔
اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور - ۵۱)	ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء : ٦١)	اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (النساء : ٦٥)	پس (اے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہونگے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسروچشم قبول کر لیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ، یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے جج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ جج بھی تھے اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ کی اس حیثیت

کے آگے بھی سمع وطاعت کا رویّہ نہ اختیار کرے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسولؐ جج کی حیثیت سے اور ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر رسولؐ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ رسول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح آپؐ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ تھے، اس لیے ان کے فیصلوں کی طرح حضورؐ کے فیصلے بھی ماخذ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی اُسے غلط سمجھے تو اس کا ایمان سلب ہو جاتے؟

رسولؐ بحیثیتِ حاکم و فرمانروا | قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ کو یہ منصب بھی رسول ہی کی حیثیت سے عطا ہوا تھا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۶۴)	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (SANCTION) سے
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰)	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح - ۱۰)	(اے نبی) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی

اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (محمد-۳۳)	اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل کر لو۔
وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا۔ (الاحزاب - ۳۶)	اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء - ۵۹)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو، یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے منصبِ رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اس کا حاکمِ مُطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کو (جن میں پوری امت اور اس کے حکمران اور اس کے "مرکزِ ملت" سب شامل ہیں) قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔ ان تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔ اس کے بعد رسولؐ کی

اطاعت۔ پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی آپ کے "مرکزِ ملت") کی اطاعت۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے، بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوتی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ، دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسول۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول کا الگ ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہدِ رسالت میں خود ذاتِ رسولؐ کی طرف اور اس عہد کے بعد سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔

سُنّت کے ماخذِ قانون ہونے پر امت کا اجماع اب اگر آپ واقعی قرآن کو مانتے ہیں اور اس کتابِ مقدس کا نام لیکر خود اپنے من گھڑت نظریات کے معتقد بنے ہوئے نہیں ہیں تو دیکھ لیجیے کہ قرآنِ مجید صاف و صریح اور قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلّم، مربّی، پیشوا، رہنما، شارحِ کلام اللہ، شارع، قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دے رہا ہے، اور حضورؐ کے یہ تمام مناصب اس کتابِ پاک کی رو سے منصبِ رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کلامِ الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر صحابۂ کرام کے دور سے لیکر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورۂ بالا تمام حیثیات میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذِ قانون ہے۔ جب تک کوئی شخص انتہائی برخود غلط نہ ہو، وہ اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ہر زمانے کے سارے مسلمان قرآنِ پاک کی ان آیات کو سمجھنے میں غلطی کر گئے ہیں اور ٹھیک مطلب بس اس نے سمجھا ہے کہ حضورؐ صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے کی حد تک رسول تھے، اور اس کے بعد آپ کی حیثیت ایک عام مسلمان کی تھی۔ آخر اس کے ہاتھ وہ کونسی نرالی لغت آگئی ہے جس کی مدد سے قرآن کے

الفاظ کا وہ مطلب اس نے سمجھا جو پوری امت کی سمجھ میں کبھی نہ آیا ؟

۲۔ رسولِ پاک کے تشریعی اختیارات | دوسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے :

"لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں ہے کہ تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے۔ بے شک حضورؐ نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔"

اسی سلسلے میں آگے چل کر آپ پھر فرماتے ہیں :

"نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے۔"

ان فقروں میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو علمِ قانون کے ایک مسلّم قاعدے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ کو لاحق ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کا اختیارِ اعلیٰ جس کو حاصل ہو وہ اگر ایک مجمل حکم دے کر یا ایک عمل کا حکم دے کر، یا ایک اصول طے کر کے اپنے ماتحت کسی شخص یا ادارے کو اس کی تفصیلات کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے اختیارات تفویض کر دے تو اس کے مرتب کردہ قواعد ضوابط قانون سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتے بلکہ اسی قانون کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ قانون ساز کا اپنا منشا یہ ہوتا ہے کہ جس عمل کا حکم اس نے دیا ہے : ذیلی قواعد (BYE LAWS) بنا کر اس پر عملدرآمد کا طریقہ (PROCEDURE) مقرر کر دیا جائے، جو اصول اس نے طے کیا ہے اس کے مطابق مفصل قوانین بنائے جائیں، اور جو مجمل ہدایت اس نے دی ہے اس کے منشا کو تفصیلی شکل میں واضح کر دیا جائے۔ اسی غرض کے لیے وہ خود اپنے ماتحت شخص

یا اشخاص یا اداروں کو قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا مجاز کرتا ہے۔ یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل بنیادی قانون کے ساتھ مل کر اس کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانون ساز نے غلطی سے ناقص قانون بنایا تھا، اور کسی دوسرے نے آکر اس کا نقص دور کیا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصّہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصّہ اپنے مقرر کیے ہوئے ایک شخص یا ادارے کے ذریعہ سے مرتب کرا دیا۔

حضورؐ کے تشریعی کام کی نوعیت | اللہ تعالیٰ نے اپنی قانون سازی میں یہی قاعدہ استعمال فرمایا ہے۔ اس نے قرآن میں مجمل احکام اور ہدایات دیکر، یا کچھ اصول بیان کر کے، یا اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر کے یہ کام اپنے رسول کے سپرد کیا کہ وہ نہ صرف لفظی طور پر اس قانون کی تفصیلی شکل مرتب کریں بلکہ عملاً اسے برت کر اور اس کے مطابق کام کر کے بھی دکھا دیں۔ یہ تفویضِ اختیارات کا فرمان خود قانون کے متن (یعنی قرآنِ مجید) میں موجود ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل - آیت ۴۴)

اور (اے نبیؐ) ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اُتاری گئی ہے۔

اس صریح فرمانِ تفویض کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی اور عملی بیان، قرآن کے قانون سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہ درحقیقت قرآن ہی کی رُو سے اس کے قانون کا ایک حصّہ ہے۔ اس کو چیلنج کرنے کے معنی خود قرآن کو اور خدا کے پروانۂ تفویض کو چیلنج کرنے کے ہیں۔

اس تشریعی کام کی چند مثالیں | یہ اگرچہ آپ کے نکتے کا پورا جواب ہے، لیکن میں مزید تفہیم کی خاطر چند مثالیں دیتا ہوں جن سے آپ سمجھ سکیں گے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح و بیان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے (وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی کہ اپنے لباس کو پاک رکھیں (وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ)۔ حضورؐ نے

اس منشا پر عمل درآمد کے لیے استنجا اور طہارتِ جسم و لباس کے متعلق مفصل ہدایات دیں اور ان پر خود عمل کر کے بتایا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر تم کو جنابت لاحق ہو گئی ہو تو پاک ہوئے بغیر نماز نہ پڑھو (النساء-۴۳-المائدہ-۶)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جنابت سے کیا مراد ہے۔ اس کا اطلاق کن حالتوں پر ہوتا ہے اور کن حالتوں پر نہیں ہوتا۔ اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنا منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لو، سر پر مسح کرو اور پاؤں دھوؤ (یا ان پر مسح کرو)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ منہ دھونے کے حکم میں کُلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے۔ کان سر کا ایک حصہ ہیں اور سر کے ساتھ ان پر بھی مسح کرنا چاہیے۔ پاؤں میں موزے ہوں تو مسح کیا جائے اور موزے نہ ہوں تو ان کو دھونا چاہیے۔ اس کے ساتھ آپ نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وضو کن حالات میں ٹوٹ جاتا ہے اور کن حالات میں باقی رہتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ رکھنے والا رات کو اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک فجر کے وقت کالا تاگا سفید تاگے سے ممیز نہ ہو جائے (حَتّٰى يَتَبَيَّنَ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس سے مراد تاریکیٔ شب کے مقابلہ میں سپیدۂ صبح کا نمایاں ہونا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اشیاء کے حرام اور بعض کے حلال ہونے کی تصریح کرنے کے بعد باقی اشیاء کے متعلق یہ عام ہدایت فرمائی کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کی گئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے اس کی تفصیل بتائی کہ پاک چیزیں کیا ہیں جنہیں ہم کھا سکتے ہیں اور ناپاک چیزیں کونسی ہیں جن سے ہم کو بچنا چاہیے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کا قانون بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میت کی نرینہ

اولاد کوئی نہ ہو اور ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ترکہ پائیگی اور دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو ترکے کا دو تہائی حصہ ملیگا۔ اس میں یہ بات واضح نہ تھی کہ اگر دو لڑکیاں ہوں تو وہ کتنا حصہ پائیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توضیح فرمائی کہ دو لڑکیوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا دو سے زائد لڑکیوں کا مقرر کیا گیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

ان چند مثالوں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ تشریعی اختیارات کو استعمال کر کے قرآن کے احکام و ہدایات اور اشارات و مضمرات کی کس طرح شرح و تفسیر فرمائی ہے۔ یہ چیز چونکہ خود قرآن میں دیئے ہوئے فرمانِ تفویض پر مبنی تھی اس لیے یہ قرآن سے الگ کوئی مستقل بالذات قانون نہیں ہے بلکہ قرآن کے قانون ہی کا ایک حصہ ہے۔

۴۔ سنت اور اتباعِ سنت کا مفہوم | تیسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ سنت رسول اللہ کا اتباع یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے کیا وہی ہم کریں، نہ یہ کہ جس طرح حضورؐ نے کیا اسی طرح ہم بھی کریں۔" اگر حضورؐ نے ما انزل اللہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ ما انزل اللہ کو دوسروں تک پہنچائے . . ."

سنت اور اس کے اتباع کا یہ مفہوم جو آپ نے متعین کیا ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ خود اُس ما انزل اللہ کے مطابق نہیں ہے جس کے اتباع کو آپ واجب مانتے ہیں۔ ما انزل اللہ کی رو سے تو سنت کا اتباع یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلم، مربی، شارح، قاضی، حاکم و فرمانروا اور شارحِ قرآن ہونے کی حیثیت سے جو کچھ فرمایا اور عمل کر کے دکھایا ہے اسے آپ سنتِ رسول مانیں اور اس کا اتباع کریں۔ اس کے دلائل میں اوپر بیان کر چکا ہوں، اس لیے انہیں دہرانے کی حاجت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے مسواک والی بات جو لکھی ہے اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ

سنجیدہ علمی مباحث میں اِس قسم کی مہمل باتوں کو بطور نظیر لا کر کسی مسئلے کا تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر نقطۂ نظر کے حامیوں میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی غیر معقول باتوں سے اپنے نقطۂ نظر کو مضحکہ انگیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے استدلال کرکے بجائے خود اُس نقطۂ نظر کی تردید کرنے کی کوشش اگر آپ کریں گے تو اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہ ہونگے کہ وزنی دلائل کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر کے آپ صرف کمزور باتیں زور آزمائی کے لیے تلاش کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کی یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے کہ اتباعِ سنت کے معنی آج کے اٹمی دَور میں تیروں سے لڑنے کے ہیں کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں تیروں ہی سے جنگ کی جاتی تھی۔ آخر آپ سے کس نے کہا ہے کہ اتباعِ سنت کے معنی یہ ہیں؟ اتباعِ سنت کے یہ معنی اہلِ علم نے کبھی نہیں لیے ہیں کہ ہم جہاد میں وہی اسلحہ استعمال کریں جو حضورؐ کے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ اس کے معنی یہی سمجھے گئے ہیں کہ ہم جنگ میں اُن مقاصد، اخلاقی اصولوں اور شرعی ضابطوں کو ملحوظ رکھیں جن کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے دی ہے، اور اُن اغراض کے لیے لڑنے اور وہ کارروائیاں کرنے سے باز رہیں جن سے آپ نے منع فرمایا ہے۔

۴۔ رسول پاکؐ کس وحی کے اتباع پر مامور تھے اور ہم کس کے اتباع پر مامور ہیں؟ | آپ کا چوتھا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کیے وہ اسی ما انزل اللہ کا، جو کتاب اللہ میں موجود ہے، اتباع کرتے تھے اور امت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳/۷) کہہ کر امت کے افراد کو تلقین کی وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضورؐ بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳)"

اس عبارت میں آپ نے دو آیتیں نقل کی ہیں، اور دونوں نہ صرف یہ کہ غلط نقل کی ہیں بلکہ نقل میں بھی ایسی غلطیاں کی ہیں جو عربی زبان کی شُدبُد کا علم رکھنے والا بھی نہیں کر سکتا۔ پہلی آیت

در اصل یہ ہے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ "یعنی پیروی کرو اُس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے"۔ آپ کے نقل کردہ الفاظ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا ہے"۔ دوسری آیت کے اصل الفاظ قرآن مجید میں یہ ہیں قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (الاعراف) "کہو کہ میں تو اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ آپ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے: "کہو کہ پیروی کر اس وحی کی جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ میں نے ان غلطیوں پر آپ کو صرف اس لیے متنبہ کیا ہے کہ آپ کسی وقت ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ایک طرف قرآن سے آپ کی واقفیت کا یہ حال ہے اور دوسری طرف آپ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ساری امت کے اہلِ علم و تحقیق قرآن کو غلط سمجھے ہیں اور آپ نے اس کو صحیح سمجھا ہے۔

اب رہا اصل مسئلہ، تو اس میں آپ نے دو باتیں کہی ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک بات آپ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں موجود ہے اور حضورؐ کو صرف اسی کی پیروی کا حکم تھا۔ حالانکہ خود قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپ ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے۔ دوسری بات آپ یہ فرماتے ہیں کہ امت کو صرف قرآن کی پیروی کا حکم ہے۔ حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ امت کو رسولِ پاک کی پیروی کا حکم بھی ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران-۳۱) "اے نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت فرمائے گا"۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ (الاعراف-۱۵۶، ۱۵۷) "میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ اور اس رحمت کو میں ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو تقویٰ کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور

ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، جو پیروی کرتے ہیں اُس رسول نبی اُمّی کی جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔"

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (البقرہ - ۱۴۳) "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا کہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔"

ان آیات میں رسول کی پیروی کرنے کے حکم کو تاویل کے خراد پر چڑھا کر یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ اس سے مراد دراصل قرآن کی پیروی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں: اگر واقعی مقصود یہی ہوتا کہ لوگ رسول کی نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کریں تو آخر کیا وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فَاتَّبِعُوا كِتَابَ اللهِ کہنے کے بجائے فَاتَّبِعُونِي کے الفاظ استعمال فرمائے؟ کیا آپ کی رائے میں یہاں اللہ میاں سے چوک ہو گئی ہے؟ پھر سورۂ اعراف والی آیت میں تو اس تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اس میں آیاتِ خداوندی پر ایمان لانے کا ذکر الگ ہے اور نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذکر الگ۔ ان سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت سورۂ بقرہ کی ہے جو ایسی ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔ مسجدِ حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دے دیں۔ یہ واقعہ ناقابلِ انکار ہے کہ وہ قبلہ آغازِ اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضورؐ اور صحابۂ کرام نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں حضورؐ کے اس فعل کی توثیق فرمائی، اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا۔ اور اسے ہم نے اپنے رسول کے ذریعہ سے اس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا بیّن

ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن احکام کا اتباع کرنے پر مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسوؐل کے ذریعہ سے جو حکم دیا جاتے اسے وہ مانتے ہیں یا نہیں! اب آپ اور آپ کے ہم خیال حضرات خود سوچ لیں کہ اپنے آپ کو کس خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں واقعی خدا کا اتنا خوف ہے کہ اس کی ہدایت کے خلاف طرزِ عمل کا تصوّر کرنے سے بھی آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، تو میری گزارش یہ ہے کہ بحث و مناظرہ کے جذبہ سے اپنے ذہن کو پاک کر کے اوپر کی چند سطروں کو مکرر پڑھیں۔ خدا کرے کہ آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو اور آپ اس گمراہی سے بچ نکلیں جس میں محض اپنے ناقص مطالعے کی وجہ سے پڑ گئے ہیں۔ (باقی)

ارض القرآن کا سفر

(از جناب محمد عاصم صاحب)

(۵)

درعیہ ۲۳ رنومبر کی دوپہر ۱۱ بجے ہمارا پروگرام درعیہ جانے کا تھا۔ امیر عبداللہ کی گاڑی ہمیں لینے کے لیے ہوٹل ہی پر آگئی۔ امیر خود صبح ہی درعیہ روانہ ہوگئے تھے۔ ہم جس موٹر سے روانہ ہوئے، اسے ان کے سکرٹری کمال انجم چلا رہے تھے، جو ایک فلسطینی مہاجر ہیں اور گزشتہ آٹھ دس سال سے امیر عبداللہ کے ہاں ملازم ہیں۔ غالباً بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے عام عربوں کی نسبت انگریزی اچھی بولتے ہیں۔

وادی حنیفہ اور مسیلمہ کذاب کا وطن ریاض سے درعیہ تک سڑک پختہ اور بہت عمدہ ہے۔ ریاض سے نکلتے ہی ہم وادی حنیفہ میں پہنچے جو شمالاً ڈیڑھ سو میل کے قریب لمبی ہے۔ یہ وہی وادی ہے جو قبیلہ بنو حنیفہ کا مسکن رہی ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام وادی حنیفہ ہے۔ اسی وادی میں ریاض سے تقریباً ۴۵ اور درعیہ سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلہ پر عَقربا نامی ایک جگہ ہے جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حضرت خالدؓ بن ولید اور مسیلمہ کذاب کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس خونریز جنگ میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے، ان کی قبریں اب بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ عقربا ہی کے ایک حصہ کا نام جُبَیلہ ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے پہلے مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے جنوب مغرب کی طرف چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام عُیَینَہ ہے جو مسیلمہ کذاب کی جائے پیدائش ہے۔ ہم ان تاریخی مقامات کو دیکھنے کی شدید خواہش رکھتے تھے، مگر وہاں کا راستہ بالکل کچا تھا اور پچھلے دو دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وادیوں میں پانی بہنے لگا تھا اور راستے خراب ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم ان مقامات کو دیکھنے کا پروگرام نہ بنا سکے

درعیہ کی تباہی ۱۲ بجے کے قریب ہم درعیہ پہنچ گئے۔ یہ بڑی ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور اس میں کھجور کے متعدد باغات پائے جاتے ہیں، جو سب کے سب کنوؤں ہی کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ۱۸۱۸ء تک یہی جگہ آل سعود کا پایۂ تخت اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت اصلاح و تجدید کا مرکز رہی ہے۔ لیکن ۱۸۱۸ء میں مصر کے ترکی گورنر محمد علی پاشا کی بیوی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیا، یہاں تک کہ آل سعود کو یہاں سے بھاگ کر ریاض کو اپنا مرکز بنانا پڑا۔ دور سے ساری بستی کھنڈرات اور مٹی کے بڑے بڑے ڈھیروں کا مجموعہ نظر آ رہی تھی۔ ہم نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کی تباہی کے آثار کا مشاہدہ کیا۔ ساری بستی میں صرف چند بکھرے ہوئے گھر آباد ہیں، باقی ساری بستی ویران پڑی ہے۔ امراء آل سعود کے محلات کی دیواریں اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سمیت اب تک قائم ہیں اور ان میں بعض کافی بلند ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیواریں کچی ہونے کے باوجود اب تک کیونکر قائم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ اس علاقہ کی مٹی بڑی مضبوط ہے اور بارش یہاں کم ہوتی ہے۔ ایک جگہ کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہاں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی مسجد تھی۔ چودھری صاحب نے اس مسجد کے اور امراء آل سعود کے محلات کے چار فوٹو لیے۔ اس کے بعد ہم امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ امیر اور ان کے ساتھ استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا سے تعارف و ملاقات کے لیے درعیہ کے بہت سے شیوخ کو بھی مدعو کر لیا تھا، جن میں شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تھے۔ ہندوستان و چین کے تعلقات اور کشمیر کے بارے میں پنڈت نہرو کی پالیسی پر گفتگو ہوتی رہی۔ پاکستان کے مذہبی فرقوں، خصوصاً شیعہ حضرات کے متعلق بھی یہ لوگ بڑے سوالات کرتے رہے۔

عرب قومیت کا فتنہ ۲ بجے کے قریب دوپہر کا کھانا ہوا، بالکل مغربی طرز پر۔ مولانا نے کھانے کے دوران اپنی گفتگو میں عرب قومیت کے فتنہ کی خوب خبر لی اور ان لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کا معاملہ، عربوں کے ساتھ اسرائیل کے معاملہ سے کسی طرح کم یا مختلف نہیں ہے لیکن عرب قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ کے اس ملک میں پنڈت نہرو آئے تو یہاں کے

بہت سے اخبارات نے انہیں رسول السلام (امن کا پیامبر) کا لقب دیتے ہوئے ان کا شاندار استقبال کیا، لیکن آپ ہی بتائیں اگر پاکستان کے لوگ بن گوریوں ـــ وزیر اعظم اسرائیل ـــ کو اپنے ہاں بلائیں اور پھر اس کا اس شان سے استقبال کریں، تو آپ لوگوں کی کیا کیفیت ہو؟ امیر عبداللہ نے اس بات کی مذمت کی کہ واقعی بعض عرب حکومتیں ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دیتی ہیں، لیکن اپنی مملکت کے متعلق انہوں نے بتایا کہ یہاں بہر حال پاکستان کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

کھانے کے بعد ہم نے امیر عبداللہ کے باغ کی سیر کی۔ کھجوروں کا سرسبز و شاداب باغ تھا جس میں کھجور کے علاوہ مالٹے اور سنگترے کے بھی درخت تھے۔ انگور بھی تھے۔ نارنگی کو یہ لوگ "یوسف آفندی" کہتے ہیں۔ آفندی ترکی لفظ ہے جو ہر اسم علم کے بعد اسی طرح استعمال ہوتا ہے، جس طرح اردو میں صاحب' یا ہندی میں بابو۔ اردن، شام اور مصر میں بھی نارنگی کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ غالباً "یوسف" نامی کوئی صاحب ہوں گے جو پہلی مرتبہ نارنگی کا درخت ان ممالک میں لائے ہوں گے۔

عصر کے قریب ہم ریاض واپس ہوئے۔ راستہ میں کمال النجم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عرب قومیت سے متاثر ہیں۔ مولانا نے ان سے دریافت فرمایا کہ بتائیے آپ کے ہاں فلسطین میں عرب عیسائیوں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ یہودی اور عرب علاقے کے درمیان بڑی سہولت سے آتے جاتے ہیں، جبکہ عربوں کے لیے اُدھر جانا اور یہودیوں کے لیے اِدھر آنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے دریافت فرمایا "آپ لوگ توقع رکھتے ہیں کہ اگر کبھی عربوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے، تو یہ عیسائی عربوں کا ساتھ دیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں شک ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا "مگر عالمِ اسلامی کے غیر عرب مسلمانوں میں سے ہر شخص آپ کا ساتھ دے گا۔" اس پر استاذ کمال النجم نے کچھ کہا تو نہیں، مگر امید ہے کہ انہوں نے محسوس کر لیا ہو گا کہ ہمارے عرب بھائی کس کی خاطر کس کی ہمدردی کھو رہے ہیں۔

کتابوں کا قیمتی ہدیہ | عشاء کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ مفتی اکبر کے بڑے صاحبزادے

شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمارے لیے پھلوں کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ ریاض میں زیادہ تر پھل لبنان سے ہوائی جہاز کے ذریعے آتے ہیں۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا چونکہ بہت دیر سے کھاتے ہیں، اس لیے رات کو پھلوں وغیرہ کا ہلکا سا ناشتہ کر لیتے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں بعض اور لوگ بھی موجود تھے۔ سعودی عرب میں بادشاہ اور دوسرے امراء کے خرچ پر حدیث، عقائد اور فقہ کی بہت سی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز ان کی اشاعت کے انچارج ہیں۔ انہوں نے ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً عنایت فرمایا جس پر ہم نے شیخ عبدالعزیز کا اور ان کے واسطے سے ان کے والد ماجد کا شکریہ ادا کیا۔ مولانا نے اپنی بعض عربی کتابیں (جو اس سفر کی حالت میں ہمارے ساتھ ہو سکتی تھیں) شیخ عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کیں اور آئندہ وعدہ کیا کہ جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہو گی، ان کی خدمت میں بھیج دی جایا کرے گی۔

اگلے روز (۲۴ نومبر) ظہر کے بعد شیخ عمر بن حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ ان کے ہاں پہنچے، تو شیخ اپنے ایک بزرگ شیخ عبداللطیف کے فتاویٰ "رسائل و مسائل" پڑھ رہے تھے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے چند حضرات کو سنا رہے تھے۔ کچھ دیر ہم بھی سنتے رہے۔ آخر میں شیخ نے کتاب کا نسخہ جسے وہ پڑھ رہے تھے، مولانا کو بطور ہدیہ پیش کیا۔

سعودی حکومت کی عنایات کھانے کے بعد ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کی مزاج پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ "پرسوں میں نے مولانا کے متعلق شاہ سعود کو ۔۔ جو ان دنوں دمام میں تھے ۔۔ تار دیا تھا، آج ان کا جواب آیا ہے اور انہوں نے دریافت فرمایا ہے کہ مولانا کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں اور ان کا ارادہ کن مقامات کو دیکھنے کا ہے؟" شیخ نے اسی وقت ہم سے تمام مقامات کے نام معلوم کر کے بادشاہ کے تار کا جواب دے دیا۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ قائم مقام وزیر اعظم امیر مساعد نے ہمارے متعلق وزارت داخلہ اور وزارت تعلیم کو تار دے دیئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ان تاروں کے نمبر اور تاریخ کا رقعہ بھی بھجوا دیا۔

عصر کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس کے ہاں ہماری چائے کی دعوت تھی۔ شیخ نے ہمیں

اپنی دو مطبوعہ کتابیں "الادب الشعبی فی جزیرۃ العرب" اور "شہر فی دمشق" بطور ہدیہ عطا فرمائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دو ماہ تک ان کا ارادہ ریاض سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا ہے[1]۔ اس کے لیے انہوں نے مولانا سے مضامین کا مطالبہ کیا۔ ہم نے وعدہ کیا کہ پاکستان واپس پہنچنے کے بعد مضامین کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔

فلبی سے ملاقات عشا کے بعد امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں کھانے کی دعوت تھی امیر نے مولانا کے اعزاز میں بہت سے دوسرے امراء اور شیوخ کو بھی دعوت دی تھی۔ امیر عبداللہ نے اسی روز دوپہر کو مولانا کی کتاب "الربا" (سود) پڑھی تھی۔ کافی دیر تک اس کی تعریف کرتے رہے۔ سود کی حرمت پر مولانا نے انجیل سے استشہاد کیا تھا۔ اس مناسبت سے انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ موضوع گفتگو رہی۔ اندازہ ہوا کہ قدیم کتابوں کے متعلق بھی امیر عبداللہ کا کافی وسیع مطالعہ ہے۔

کھانے کے دوران معلوم ہوا کہ اسی میز پر مسٹر سینٹ جان فلبی (الحاج عبداللہ فلبی) بھی موجود ہیں۔ سینٹ جان فلبی مشہور انگریز مستشرق ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جہلم کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر ۱۹۱۶ء میں جنگی خدمات کے سلسلے میں عراق گئے۔ عرب جغرافیہ سے انہیں خاص دلچسپی تھی ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ نجد گئے اور وہیں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر داخل اسلام ہوئے اور مستقل طور پر ریاض میں اقامت اختیار کر لی۔ عرب جغرافیہ کے متعلق ان کی بہت سی کتابیں ہیں جو اس قدر تحقیقی شمار کی جاتی ہیں کہ مغربی ممالک میں جب تک یہ کتابیں کسی مصنف کے سامنے نہ ہوں وہ عرب جغرافیہ کے متعلق کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلبی ریاض میں موجود ہوں گے۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ امیر عبداللہ کی اس دعوت میں موجود ہیں تو ہماری نگاہیں فوراً ان کی تلاش کے لیے اٹھ گئیں۔ وہ ہمارے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر بالکل عربی لباس میں تھے اور رنگ میں بھی انگریزوں جیسی سرخی نہ تھی۔ اچھی خاصی ڈاڑھی بھی تھی اس لیے ہم انہیں نہ پہچان سکے۔ کھانے

---

[1] یہ رسالہ مارچ ۱۹۶۰ء سے "الجزیرۃ" کے نام سے جاری ہو گیا ہے اور ہمارے پاس مسلسل آ رہا ہے۔

کے بعد امیر عبد اللہ نے خاص طور پر ان کا مولانا سے تعارف کرایا اور پھر دونوں میں چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو عربی میں کرتے تھے اور بقول مولانا کے بالکل بدوؤں کی زبان انہی کے لہجے میں بولتے تھے۔ ان دنوں مولانا ان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب "IN THE LAND OF MIDIAN" (سرزمین مدین میں) کا مطالعہ کر رہے تھے جس میں انہوں نے مدین کی سرزمین کے حالات بیان کیے ہیں۔ اسی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے تفصیلی گفتگو کے لیے ان سے اگلے روز صبح کا وقت لیا۔ تاکہ سفر کے متعلق ان کی معلومات سے استفادہ کیا جا سکے۔ امیر عبد اللہ اور فلبی کی مزاحیہ انداز میں خوب جھڑپ رہی۔ امیر عبد اللہ نے بتایا کہ ان حضرت کی ساری کوشش یہ ہے کہ آثار کے ذریعے ان تمام چیزوں کو صحیح ثابت کیا جائے جن کا ذکر انجیل اور توراۃ میں آیا ہے۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ حدیث کو۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مجھ سے عربی اچھی جانتے ہیں حالانکہ ان کی عربی اتنی ہی ہے جتنی میری انگریزی۔" امیر نے ان کے جہل ــــ دراصل چالاکی ــــ کی دو مثالیں بھی دیں۔ ایک یہ کہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم بادشاہ تھے، کیونکہ قرآن کہتا ہے:
"الم تر الی الذی حاج ابراھیم ان آتاہ اللہ الملک" اور انجیل سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ دولت مند آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ بلقیس (ملکہ سبا) اور حضرت سلیمان کے درمیان ہزاروں سال کا زمانہ تھا۔

تمام لوگ یکے بعد دیگرے اجازت لیکر جانے لگے تو امیر نے مولانا کو روک لیا۔ پہلے فلبی ہی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ امیر نے بتایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس شخص کا اسلام محض جغرافی قسم کا ہے اور اس کے خیالات ابھی تک عیسائیوں جیسے ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ خائن یا انگریزوں کا جاسوس ہے، کیونکہ ہمارا تجربہ ہے کہ اس سے کوئی بات ہضم نہیں ہوتی؛ اور پھر چالیس سال کے عرصہ میں اس سے کوئی چیز ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس کے خائن یا جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہو۔" مولانا نے فرمایا "میرا خیال ہے کہ یہ شخص صرف اس لیے مسلمان ہوا ہے کہ اسے عرب جغرافیہ سے دلچسپی تھی، لیکن مسلمان ہوئے بغیر اس کے لیے جزیرہ

عرب میں گھر رہنا ممکن نہ تھا، اس لیے یہ مسلمان ہو گیا"۔ مولانا نے یہ بھی بتایا کہ میں نے اس کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن کسی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے اسلام سے بھی کوئی تعلق ہے۔ ان دنوں میں اس کی کتاب "سرزمین مدین میں" پڑھ رہا ہوں۔ اس میں دو تین موقعوں پر اس نے صحراء میں کرسمس منانے کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر یہ کہ اس کی تمام کتابیں اس کے اصل نام سینٹ جان فلبی کے نام سے شائع ہوتی ہیں نہ کہ عبداللہ فلبی کے نام سے"۔

فلبی کو سعودی حکومت کی طرف سے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق امیر عبداللہ نے بتایا کہ یہ بہت معمولی ہے اور یہ شخص فقیر ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے۔ غالباً آپ حضرات کو یہ خیال نہیں کہ اس کی بہت سی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ان سب کی آمدنی اسے ملتی ہے۔

سعودی عرب کے معاشی مسائل دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے مولانا نے پھر اجازت چاہی لیکن امیر نے ابھی اور بیٹھنے کی خواہش کی۔ اب کی مرتبہ گفتگو سکندر مرزا اور ظفراللہ خاں کی نکتہ زناری پر رہی۔ پھر گفتگو کا رخ سعودی عرب میں زراعت و صنعت کی طرف پھر گیا۔ مولانا نے امیر کو توجہ دلائی کہ مملکت کو کم از کم خوراک میں خود کفیل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت تو جیسا کہ ہم نے دیکھا اور سنا ہے یہ حال ہے کہ کھانے اور پہننے کی ہر چیز حتیٰ کہ گوشت، ترکاری اور انڈے اور نمک اور پیاز تک باہر سے آتی ہے۔ مولانا نے اچھے انداز میں یہ بھی واضح کیا کہ صرف پٹرول کی آمدنی اور اس کے ذریعے باہر سے کھانے، پہننے اور دوسرے استعمالات کا جو سامان حاصل ہو جاتے۔ اسی پر بھروسہ کرتے رہنا بالآخر عربوں کو بڑی پریشان کن حالت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ امیر نے ان تمام باتوں کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے زراعت کی ترقی کے لیے بے انتہا کوشش کی ہے۔ بہت سے لوگوں کو زمینیں بھی دی ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولت پہنچانے کا بھی انتظام کیا ہے لیکن لوگ ہیں کہ زراعت پر محنت نہیں کرتے اور اس کے بجائے تیل کی کمپنی میں ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہاں معمولی کام پر خوب آمدنی ہوتی ہے لیکن بہرحال ہماری کوشش جاری ہے اور اس

بارے میں بڑے فکرمند ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے پھر اجازت چاہی تو امیر مولانا کو قصر کے باہر تک چھوڑنے آئے اور اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک ہماری موٹر روانہ نہیں ہو گئی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین نے بتایا کہ امیر عبداللہ وزیر اعظم تک کو الوداع کہنے کے لیے قصر سے باہر نہیں آتے۔ گفتگو بھی وہ بڑی ہی محبت اور لگاؤ سے کرتے رہے۔

نظریاتی کشمکش اسی رات ہمیں ایک اور صحبت میں عرب کی دو اہم شخصیتوں کے درمیان ایک دلچسپ اور گرما گرم بحث سننے کا اتفاق ہوا جس سے سعودی عرب کی اندرونی حالت کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب علماء کی تعریف اور مدافعت کر رہے تھے، اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "ان علماء کی عام نوجوانوں کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علماء اسلام کے صحیح نمائندہ نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے شیخ عبدالعزیز بن باز کا نام لیا گیا۔ فریقِ مخالف نے کہا" وہ بلاشبہ بڑے مخلص اور اپنی حدود تک عالم آدمی ہیں، لیکن ان کا دائرۂ معلومات بہت تنگ ہے اور یہ سوائے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل بیان کرنے کے موجودہ زمانے کے بڑے اور اہم مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل پیش نہیں کر سکتے۔ مانا کہ یہ تمام علماء بے ایمان نہیں، لیکن عاجز ضرور ہیں۔" پہلے صاحب کہہ رہے تھے کہ "اصلاح بہرحال ان ہی علماء کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ ضرورت ان سے اچھے انداز میں کام لینے کی ہے۔" دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "یہاں اصلاح نوجوانوں کے ذریعے ہو گی۔ اس وقت اسلام سے انحراف، بے دینی اور مغرب پرستی کی جو روح پھیلتی چلی جا رہی ہے اس کا مقابلہ کرنا ان علماء کے بس کا روگ نہیں۔ یہ علماء عوام کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اس زمانے کی دوسری مفید ایجادات کے استعمال سے روکتے ہیں، حالانکہ یہ تعلیم پھیلے گی اور اس وقت یہ علماء کچھ نہ کر سکیں گے اور سوائے اس کے کہ ان کے خلاف عوام کی نفرت بڑھ جائے اور کچھ نہ ہو گا۔ دوسری طرف یہ امراء کی عیاشیوں کو

دیکھتے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ شیخ عبد العزیز بڑی ہی جرأت اور بے باکانہ انداز سے بادشاہ اور دوسرے امراء پر تنقید کرتے ہیں، لیکن بادشاہ اور بعض امراء تو بلاشبہ ان کی بڑی قدر کرتے ہیں، لیکن عام امراء اور اصحاب اقتدار خوب سمجھتے ہیں کہ ان کی گرمی اور تنقید کا مذان کیا ہے، اس لیے وہ ان کو خوش کرنے کے لیے بس چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں۔"

ان دونوں صاحبوں کی زبانی ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی پریشانی ہوئی کہ یہاں کے امراء میں امیر عبداللہ بن عبد الرحمٰن اور مساعد بن عبد الرحمٰن کو چھوڑ کر قریب قریب سب ہی کے گھروں میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو اس زمانہ کے کسی مغرب زدہ گھرانے میں ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے بیٹے اور بیٹیاں انگریزی اور فرنچ پڑھتی اور بولتی ہیں، گھروں میں عورتوں کے لباس اور وضع قطع پوری طرح مغربی ہیں، بعض تو اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں امریکہ ہی میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ان کی استانیاں اور نگران سب کی سب امریکن عورتیں ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نئی پود جب بڑھے گی اور اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہوں گی تو ملک کا کیا حال ہوگا۔

۱۱ بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس آئے اور بڑی دیر تک اس صورت حال پر افسوس کرتے رہے[1]۔

فلبی سے دوسری ملاقات اگلے دن (۲۵ نومبر) صبح ۱۰ بجے ہم سینٹ جان فلبی کی ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ قدیم ریاض کی ایک گلی میں ان کا مکان ہے۔ اگرچہ دو منزلہ ہے، لیکن بہت پرانا اور بوسیدہ ہے۔ اس میں وہ بالکل عربوں کی طرح رہتے ہیں۔ معاشرت میں انگریزیت کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔ ہمیں انہوں نے اپنی لائبریری میں بٹھایا اور کافی دیر تک

---

[1] اس صورتِ حال پر تبصرہ مولانا کی اس تقریر میں آ رہا ہے، جو انہوں نے جدہ میں کی۔ یہ تقریر ان شاء اللہ اس سفرنامہ کی اگلی [illegible] قسط میں [illegible] ہے۔ (م۔ ش۔ ح)

مختلف کتابیں دکھاتے رہے ۔ انگریزی رسالوں میں ان کے جو تازہ مضامین شائع ہوتے تھے وہ بھی ہمیں دکھاتے رہے ۔ اب کی مرتبہ گفتگو انگریزی میں ہوئی ۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ ابھی چند سال ہوئے انہوں نے مدین کے علاقہ کا جو دورہ کیا ہے، اس کے لیے مرحوم شاہ عبدالعزیز (موجودہ فرمانروا شاہ سعود کے والد) نے پندرہ ہزار ریال دیئے تھے اور ایک جیپ اور ایک کار کا بھی انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بھی بیان کیا اور وہ اس طرح کہ وہ جہلم میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اپنے دفتر کے ایک حافظ صاحب (جن کا انہوں نے نام بھی بتایا تھا، مگر میں بھول گیا) سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور اس طرح انہیں اسلام کے متعلق مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیمبرج میں پنڈت نہرو کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اور سفر کے سلسلہ میں انہوں نے بعض مفید مشورے دیئے۔ مولانا اور چودھری صاحب کے انہوں نے پتے بھی اپنے پاس نوٹ کیے کہ شاید کبھی پاکستان آنا ہو تو ملاقات ہو سکے۔

عربی کھانے

ظہر کے بعد مفتی اکبر کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ تین بجے کے قریب ہم ان کے ہاں پہنچے۔ مفتی صاحب نے دعوت کا خاص اہتمام کیا تھا اور آل الشیخ کے تقریباً سب ہی مشائخ کو مدعو کیا تھا، جن میں ان کے بڑے بھائی شیخ عبداللہ بن ابراہیم (جو نابینا ہیں اور بہت ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے) بھی شامل تھے۔ پہلے ایک کمرے میں نشست رہی۔ پھر کھانے کیلئے دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی سینی میں چاولوں پر پورا بکرا سالم پکا کر رکھا ہوا تھا۔ مولانا نے تعجب سے پوچھا کہ پورا بکرا سالم کیسے پکا لیا جاتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ سالم بکرا پکا لینا تو کوئی چیز ہی نہیں، ابھی دو سال ہوئے حجاز کے کسی مقام پر بادشاہ کی دعوت میں ایک سوڈانی باورچی نے سالم اونٹ پکا کر پیش کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا "اگر ہاتھی حلال ہوتا تو عرب کے باورچی شاید اسے بھی مسلّم پکا ڈالتے"۔ مفتی صاحب نے فرمایا "جی ہاں۔ ہمارے ہاں نجد میں بعض دیگیں اتنی بڑی بڑی ہیں کہ ان میں تین اونٹ ایک ساتھ پکائے جا سکتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا "غالباً یہ دیگیں حضرت سلیمانؑ کے وقت سے چلی آرہی ہوں گی"۔ اس دعوت میں

ایک اور لطیفہ رہا کہ استاذ عبدالحکیم عابدین کھانے پر مولانا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے عربوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان کے سامنے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈالتے جاتے ہیں استاذ عبدالحکیم عابدین نے بکرے کی سری سے آنکھ نکالی اور مولانا سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ اسے کھانا پسند فرمائیں گے ؟ مولانا نے جھر جھری لی اور یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ عربوں کے ہاں آنکھ کو بڑا ہی مزے دار تصور کیا جاتا ہے اور اسے بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز بڑی ہی حیرت انگیز تھی۔

کھانے کے بعد پھر نشست رہی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس مجلس میں مفتی صاحب نے بھی یہ بات دہرائی کہ اگر ابن تیمیہؒ اور محمد بن عبدالوہابؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف ہوتا ہے، تو ہم اسے ترک کر دیتے ہیں۔

عرب میں لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت عصر کے بعد ہندوستان کے چند طلبہ نے، جو ریاض کے کلیۃ الشریعہ یا اس کے تحت معہد میں پڑھتے ہیں، ہمیں اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا۔ اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی، لیکن یہ حضرات ہمیں لینے کے لیے بروقت پہنچ گئے۔ ہمیں قدیم ریاض کی ایک گلی میں جانا تھا۔ بارش میں تمام گلیوں کا بہت ہی بُرا حال ہو رہا تھا اور پرنالوں سے پانی گزرنے والوں کے سروں پر گر رہا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے۔ بہت ہی خستہ اور تنگ و تاریک قسم کا مکان تھا۔ معلوم ہوا کہ کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے لیے قیام کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے، اپنے طور پر جو طالب علم کہیں انتظام کر سکتا ہے کر لیتا ہے۔ ریاض کے بہت سے لوگوں نے نئے محلوں میں پختہ مکان بنا لیے ہیں اور اپنے پرانے کچے مکانات وقف کر دیئے ہیں عموماً طلبہ کا قیام ان ہی مکانوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مکان میں ہم پہنچے تھے، وہ بھی اسی قسم کا مکان تھا۔ وہاں طلبہ کے علاوہ شیخ عبدالرزاق عفیفی سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ ان سے تسری یعنی لونڈیوں ـــ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ سعودی عرب میں اس زمانہ میں بھی غلاموں اور لونڈیوں کا رواج ہے۔ شیخ عفیفی نے بتایا کہ یہاں جو غلام اور لونڈیاں آتی ہیں وہ یا تو مسقط اور عمان کی طرف سے

آتی ہیں یا لبنان کی طرف سے۔ ان کے جواز کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی ہے کہ لونڈی ۔۔ یا غلام آکر یہ کہتی ہے کہ "میں لونڈی ہوں اور میرے آباؤ اجداد قدیم زمانہ سے غلام چلے آتے ہیں" اس کے صرف اس بیان پر اسے خرید لیا جاتا ہے اور اس کے لانے والے سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ وہ اسے کیسے لایا ہے، وہ اسے لالچ دے کر بھی لا سکتا ہے، ڈرا کر بھی لا سکتا ہے اور اس کے ماں باپ سے خرید کر بھی لا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی لونڈی ۔۔ یا غلام ۔۔ کہ دے کہ مجھے زبردستی لونڈی ۔۔ یا غلام ۔۔ بنایا گیا ہے تو اسے آزاد کر دیا جاتا ہے" مولانا نے فرمایا کہ "آخر وہ یہ بات کہہ کیسے سکتی ہے؟ آزاد ہو کر وہ تنہا جائے گی کہاں؟" اس پر شیخ عفیفی خاموش ہو گئے۔ انہوں نے پھر بتایا کہ لونڈیوں کے جواز پر بعض لوگ فقہاء کی کتابوں سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ کافر کو فروخت کیا جا سکتا ہے، کافر خود بھی اپنے آپ کو فروخت کر سکتا ہے اور اپنے بیٹے یا بیٹی کو بھی فروخت کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسے یا اس کے بیٹے یا بیٹی کو خریدا جا سکتا ہے، گویا خَطٌّ فی عُنُقِ الْعَقَبَہ تَخْرُجُ سالمًا (الایلا بر سرِ ملّا) والا معاملہ ہے۔

عشاء کے بعد ہم شیخ سلیمان العبید رئیس المحکمۃ الکبریٰ (چیف جج ہائی کورٹ) کے ہاں کھانے پر گئے۔

اگلے دن (۲۶ر نومبر) ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں صبح کے ناشتہ پر گئے۔ شیخ نے مولانا کی بعض کتابیں پڑھ لی تھیں۔ بڑی دیر تک ان کی تعریف کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کا بھی وعدہ فرمایا۔

۹ بجے (صبح) کے قریب ہم استاذ حمد الجاسر سے ملاقات کے لیے ان کے پریس گئے بارش ہو رہی تھی۔ گلیوں کا برا حال تھا۔ بعض جگہوں پر تو ہماری موٹر پھنستے پھنستے بچی۔

۱۰ بجے ہمارا پروگرام شیخ سلیمان العبید کی دعوت پر ان کے محکمہ (عدالت) جانے کا تھا، مگر ہمیں بارش کی وجہ سے استاذ حمد الجاسر کے پریس میں دیر ہو گئی۔ شیخ کی گاڑی ہوٹل آکر واپس چلی گئی۔ ہم چاہتے تھے کہ عدالت جا کر سعودی نظامِ عدالت کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ مگر افسوس کہ بارش نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

سرکاری دفاتر میں نماز کی پابندی | ۱½ ۱۱ بجے کے قریب میں تنہا وزارت تعلیم کے دفتر گیا ہمارا خیال تھا کہ وزارت تعلیم سے ایک تو جزیرہ عرب کے متعلق کچھ نقشے حاصل کیے جائیں اور دوسرے یونیورسٹی کے تحت چلنے والے کالجوں اور سکولوں کا نصاب۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن (سکرٹری وزارت تعلیم) موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ دونوں چیزیں فراہم کرنے کا حکم دیا مگر انہوں نے لانے میں بڑی دیر کر دی۔ اس اثنا میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بڑی ہی خوشی ہوئی کہ وہیں دفتر میں ایک شخص نے اذان دی اور تمام لوگ کام چھوڑ کر ایک وسیع کمرے میں پہنچ گئے، جو نماز کے لیے مخصوص تھا اور اس کے دروازے پر خوبصورت خط میں "المسجد" لکھا ہوا تھا۔ شیخ عبدالعزیز نے جماعت کرائی اور نماز کے بعد تمام لوگ واپس آکر پھر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ شیخ عبدالعزیز جامعہ ازہر کے کلیتہ اصول الدین (COLLEGE OF THEOLOGY) کے فارغ التحصیل ہیں اور وزارت تعلیم کے سکرٹری ہونے کے علاوہ ـــ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ـــ حرم مکی کے خطیب اوّل بھی ہیں۔

(باقی)

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از

مولانا سید ابوالا علیٰ مودودی

* یہ وہ کتاب ہے جس کی ضرورت خود مولانا مودودی صاحب نے آج سے ۳۰، ۲۸ برس قبل محسوس فرمائی اور اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں اس موضوع پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ لیکن خدا کی قدرت کہ اس سے پہلے اس کی تکمیل کی نوبت نہ آئی

* آج سے چند سال قبل جب مولانا کو پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال کر چودہ سال کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا تو ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۵۵ میں غیر مکمل صورت میں شائع کر دیا گیا جو جلد ہی ختم ہو گیا۔

* اب مولانا نے ان مضامین پر نظر ثانی کر کے ان کو مکمل بھی کر دیا ہے اور بعض مضمون کو دوبارہ لکھا ہے جس سے کتاب کی افادیت بھی اور ضخامت بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے

* یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ "اسلامی تہذیب" پر اس سے بہتر، مستند، قابل اعتماد اور عام فہم کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

عمدہ کتابت و طباعت، کتابی سائز کے ۳۶۸ صفحات

مضبوط جلد۔ آرٹ پیپر کا دیدہ زیب گرد پوش۔ قیمت ساڑھے چار روپے

★

اپنے قریبی کتب فروش سے یا صرف تین پیسے کا پوسٹ کارڈ لکھ کر

ہم سے بذریعہ وی۔پی طلب کیجئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور